ماہنامہ

قلندر شعور

اکتوبر ۲۰۱۹ء

سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

الله

باادب بانصیب
بےادب بےنصیب

جلد 7 شمارہ 9 | اکتوبر 2019ء | صفر ـ ربیع الاوّل 1441ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ـــ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 80 روپے..... سالانہ ہدیہ 1080 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ ، بیرونِ پاکستان 70 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: +92 (0)213 6912020

۳۴ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ	بابا گرونانکؒ	10
نعت رسول مقبول ﷺ	ادیبؔ رائے پوری	11
رباعیات	ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ	12
آج کی بات	مدیر مسئول	14
فقیر کی ڈاک	ادارہ	19
نامے میرے نام	خانوادہ سلسلہ عظیمیہ	21
قُوت لایموت	حامد ابراہیم (M.A-Fine Arts)	25
پیراسائیکالوجی ــ مسائل کا حل	خواجہ شمس الدین عظیمی	31
سرخ، زرد یا بے رنگ ــ؟	گلِ نسرین	35
درخت باتیں کرتے ہیں	زاہدہ تبسم (M.Sc-Zoology)	41
نو کروڑ میل دور ــ؟	بلال حسن زئی	47
بادشاہ کون ــ؟	ایک عظیمی بہن	53
خمیر کیا ہے ــ؟ پھیلنا سمٹنا	ڈاکٹر نعیم ظفر (Ph.D.) UAE	59
گوبھی کا پھول	عابد محمود	63
جولائی 2019ء کے سرورق کی تشریح	قارئین	69
تان سین	سارہ خان (M.A-Mass Comm.)	75

دوکشتیوں میں سوار مسافر	نفیسہ شاکر	81
عقل مند چیتا	لیفٹیننٹ کرنل اے لاک	87
تھوڑی روشنی اندھیرے پر غالب ہے	فرزانہ پرویز	93
سراب	سید اسد علی (MBA)	99
اقتباسات	قارئین	105
پورب کے ہم زاد	محمد عدنان خان (M.Sc-Applied Physics)	109
فہم کیا ہے—؟	مجتبیٰ حسین	115
یقین کی دنیا	آسیہ روبی (M.A-Urdu)	121
اللہ میاں کے باغ کے پھول — اولی الالباب بچے	ادارہ	126
اللہ میاں کے باغ کے پھول — باادب بانصیب	حسن زمان	128
اللہ میاں کے باغ کے پھول — بچو! آپ کیا سمجھے—؟	آمنہ حیات	132
آپ کے خواب اور ان کی تعبیر	عظیمی خواجہ شمس الدین	135
What Do We See?	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	147
Prophet Jesus (PBUH)	Extracted	151
The Art of Gratefulness	Muhammad Arif	158
Life Lessons from a Faqir	Bibi Anuradha (UAE)	162
Values of a Saint	Muhammad Zeeshan	167
Message of the Day	K. S. Azeemi	172

حمد باری تعالیٰ

بابا گرو نانکؒ

انت نہیں کچھ وصفوں کا کچھ تیری ثنا کا انت نہیں
انت نہیں کچھ قدرت کا کچھ تیری عطا کا انت نہیں
انت نہیں آوازوں کا نظاروں کا کچھ انت نہیں
انت نہیں کچھ بھیدوں کا اسراروں کا کچھ انت نہیں
تیرا انت نہ کوئی جانے تیری تھاہ نہ پائی ہے
جتنا جتنا کہتے جائیں اتنی اور بڑائی ہے
جانے کون بڑائی تیری اونچا پاک مقام ترا
اونچوں کے بھی اونچوں سے ہے اونچا یارب نام ترا
اتنا اونچا کون بھلا جو اس اونچے کو جانے گا
سب اونچوں سے اونچا ہو جب اونچے کو پہچانے گا
جانے آپ بڑائی اپنی سمجھے اپنی عظمت کو
اس کی چشمِ کرم سے نانکؒ بخشش ہو اور رحمت ہو

ادیبؔ رائے پوری

نعت رسول مقبول ﷺ

یا محمدؐ نورِ مجسم، یا حبیبی یا مولائی
تصویرِ کمالِ محبت، تنویرِ جمالِ خدائی

تیرا وصف بیاں ہو کس سے، تیری کون کرے گا بڑائی
اس گردِ سفر میں گم ہے، جبریلِ امیں کی رسائی

تیری ایک نظر کے طالب، تیرے ایک سخن پر قرباں
یہ سب تیرے دیوانے، یہ سب تیرے شیدائی

یہ رنگِ بہارِ گلشن، یہ گل اور گل کا جوبن
تیرے نورِ قدم کا دھون، اس دھون کی رعنائی

اے مظہرِ شانِ جمالی، اے خواجہ و بندۂ عالی
مجھے حشر میں کام آجائے میرا ذوقِ سخن آرائی

تو رئیسِ روزِ شفاعت، تو امیرِ لطف و عنایت
ہے ادیبؔ کو تجھ سے نسبت یہ غلام ہے تو آقائی

یا محمدؐ نورِ مجسم، یا حبیبی یا مولائی
تصویرِ کمالِ محبت، تنویرِ جمالِ خدائی

ساقی پہ نگاہ رکھ

میخانہ میں آ ملک سلیماں یہ ہے
شیشہ ہے پیالہ ہے شبستاں یہ ہے
معلوم نہیں سبا کی ملکہ کیا تھی
ساقی پہ نگاہ رکھ کہ چراغاں یہ ہے

’’اے ایمان والو! اللہ کے لئے تقویٰ اختیار کرو اور اس تک پہنچنے کے لئے وسیلہ ڈھونڈو۔ اور اس کے راستہ میں جدوجہد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔‘‘ (المائدہ: ۳۵)

حضرت سلیمانؑ کی زمین، ہوا، فضا، جن وانس، چرند پرند اور آبی مخلوقات پر حکومت تھی۔ جو جاہ وحشمت، عروج و استحکام اور انعامات حضرت سلیمانؑ کو عطا ہوئے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ مخلوقات پر تصرف مقداروں کا علم ہے۔

قیمتی پتھروں اور جواہرات سے مزین حضرت سلیمانؑ کے محل میں ملازمین اور درباری علوم وفنون میں باکمال اور منفرد تھے۔ ایک جن نے کہا، اس سے پہلے کہ دربار برخاست ہو، میں میلوں دور سے ملکہ کا تخت لے آؤں گا۔ وہیں پر موجود کتاب کا علم رکھنے والا بندہ بولا، یہ کام آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے ہو جائے گا اور تخت حاضر تھا۔ معلوم نہیں سبا کی ملکہ میں کیا کشش تھی البتہ جو فرد ساقی کے میخانہ میں داخل ہوتا ہے اس کے لئے دنیا کی حسین وقیمتی شے بے کشش ہو جاتی ہے۔ ساقی پہ نگاہ رکھنے سے ہر شے کی اہمیت صفر ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ سب ساقی کے میخانہ میں موجود ہیں۔

دنیا میں علم اور عروج، ساقی کی قربت سے ملتا ہے۔ روحانیت میں ساقی وہ ہے جو معرفت کا جام پلاتا ہے اور یہ ہستی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ اللہ تک پہنچنے کے لئے راہ نما بھی چاہئے اور راستہ بھی۔ اگر ساقی کا کرم ہو جائے تو یہ سب چیزیں از خود فراہم ہو جائیں گی کیوں کہ ساقی کا میخانہ ہی وہ مقام ہے جہاں سے نور کا ظہور — چراغاں ہوتا ہے۔ ساقی کے علاوہ اس دنیا میں ہر شے الوژن ہے۔

آج کی بات

میں تنہائی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں کیا ہوں ــــ؟ کہاں سے آیا ہوں ۔ ہر روز کون سی غیب کی دنیا میں چھپ رہا ہوں اور دوسرے دن ظاہر ہو جاتا ہوں ۔ آخر غیب ہونا، غیب کا ظاہر ہونا، ظاہر کا غیب ہونا ــــ آخر یہ کھیل کیا ہے؟

تخلیق کا راز بڑے صاحب جانتے ہیں ــــ میں نہیں جانتا۔

پیدائش سے پہلے کہاں تھا، پیدائش کے بعد ظاہر کس طرح ہوا؟ قدم بقدم ظاہر ہونے والا میرا جسم بڑھنے کے عمل میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن کا بچہ غیب ہوا، دوسرے دن ظاہر ہو گیا۔ دوسرا دن پردہ میں چھپ گیا تو تیسرا دن ظاہر ہو گیا اور غیب و شہود کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایسے مقام پر جا ٹھہرا کہ غیب کے جس عالم سے میں ظاہر میں آیا تھا دوبارہ غیب میں غائب ہو گیا۔ دنیا میں آنے سے پہلے غیب میں تھا اور دنیا میں ظاہر ہونے کے بعد پھر غیب میں چلا گیا۔ غیب و شہود کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کب شروع ہوا اور یہ بھی علم نہیں ہے کہ کب ختم ہو گا۔

ذہن کے پردوں میں سرسراہٹ کے ساتھ حرکت ہوئی تو تصویر بنی۔ تصویر سامنے آئی تو ایک نہیں تھی ــــ تصویر در تصویر ہجوم تھا۔ بالآخر ہجوم بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ کوئی قبر میں جا سویا اور کوئی عالی شان محل میں براجمان ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔

''اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے کہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے، اور فرماں برداروں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔'' (النحل: ۸۹)

روحانی سلسلہ غیب وشہود کا انسٹی ٹیوٹ (institute) ہے۔اس میں داخل ہونے کے بعد شکوک وشبہات اور مایوسی کے خیالات کا ہجوم ہو جاتا ہے۔شیطان کا مشن ہے کہ بندہ ناخوش ہو جائے۔ناخوشی کے لئے شیطان کا خودکار ہتھیار ''انا'' کا خول ہے۔آدمی انا میں سمٹنے لگتا ہے ـــ اس کی سوچ اور شخصیت قیاس بن جاتی ہے۔اللہ کے لئے ذرا سا کام ہو جائے تو اسے بہت بڑا کارنامہ قرار دیتا ہے اور اس کم زوری کے سبب اپنے حقوق قائم کر لیتا ہے۔ذہن سے یہ بات نکل جاتی ہے کہ اللہ نے لاشمار نعمتوں سے نوازا ہے۔

ایک دولت مند شخص نے گلہ کیا کہ میرا دوست اللہ سے باغی ہو گیا ہے کیوں کہ اللہ نے اس کی دعا قبول نہیں کی۔اس نے اپنے باپ کے زندہ رہنے کی دعا کی تھی۔لاکھوں روپے علاج پر خرچ کر دیئے مگر باپ مر گیا۔میں نے جواب دیا کہ اول تو یہ دعا ہی غلط تھی۔تم نہیں مروگے تو تمہاری کرسی پر تمہارا بیٹا کیسے بیٹھے گا؟ مرنا جینا دونوں کام اس قدر یقینی ہیں کہ ان سے کسی بھی طرح چھٹکارا نہیں۔تمہارا دوست جس گھر میں رہتا ہے، اس گھر کی زمین کی قیمت اس نے اللہ کو کتنی دی ہے؟ جو سرمایہ لئے بیٹھا ہے اگر پیدائشی طور پر اس کا ذہن یا جسم مفلوج ہوتا یا وہ مفلوک الحال ہوتا تو ـــ؟

• • ———————— • •

قارئین خواتین وحضرات! آپ کی روح خوب صورت اور ذہن دل کش ہے۔

یہ دل کشی اور خوب صورتی ہمارا کارنامہ نہیں ـــ احسن الخالقین اللہ کا انعام ہے۔

مایوسی اور پریشان خیالی راستہ کا اتار چڑھاؤ ہیں۔مسافر سفر کرتا ہے تو اسے طوفان، گرد وغبار اور تکان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔حقیقی مسافر وہ ہے جو منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے، اس کا مقصد منزل کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور منزل چوں کہ سامنے نہیں ہے اس لئے وہ ہر حال میں چلتا رہتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ آپ ان پریشان کن خیالات سے نکل آئیں گے

جو روحانی راستہ میں سب کو پیش آتے ہیں۔

آپ نے مجھے استاد بنایا ہے، میں نے بھی آپ کو آنکھوں کی روشنی بنا کر قبول کیا ہے۔ میرے اوپر فرض ہے کہ میں آپ کو راستہ کی بھول بھلیوں سے آگاہ کرتا رہوں۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ منزل کے علاوہ چھوٹی بڑی عارضی شے قبول نہ کریں۔ منزل جب مل جاتی ہے تو ہر شے منزل رسیدہ شخص کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

خوش رہنے والے لوگ اللہ کے دوست ہیں اس لئے میرے تصور میں جب آپ کا ہنستا، مسکراتا چہرہ غم آلود ہوتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ کیا بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ــــ؟

دنیا میں میرا اور آپ کا کوئی نہیں ہے۔ کوئی ہمیں چھوڑ جائے گا اور زیادہ کو ہم چھوڑ جائیں گے۔ آخری سرمایہ دو گز قبر ہے، وہ بھی اس وقت جب ہمیں مل جائے۔ ہمارا جسمانی نظام قبر کے اندر کیڑوں کی خوراک ہے۔ ہماری انا مٹی کے ذرّات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انا کے ذرّات کو آدمی، کتّے، بلیاں، گدھے، گائے اور بھینس پیروں میں روندتے پھرتے ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے سر اور تاج ــــ بڑے بڑے نمرود، فرعون، شداد اور قارون گزرے ہیں، زمین نے انہیں نگل کر مٹی کے ذرّات میں تبدیل کر دیا۔ آج ہم ان لوگوں کی مٹی کے ذرّات پر چل پھر رہے ہیں۔

• • ——————— • •

کون و مکاں کے اسرار کے امین ــــ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ

’’آدمی اللہ کے لئے ایک قدم اٹھاتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے احسان کر دیا ہے، نعوذ باللہ! وہ کیوں نہیں سوچتا کہ اللہ نے نو مہینے ماں کے پیٹ میں رزق فراہم کیا، پیدائش کے بعد سوا دو سال تک بلا مشقت غذا کا اہتمام کیا۔ ہوا، پانی، آکسیجن اور سارے وسائل عطا کئے۔ مخلوق سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت سے نوازا، صحت اور اولاد دی، عزت و

وقار عطا کیا، کاروبار کرنے کے لئے عقل دی۔ آدمی 70، 80 سال زندہ رہتا ہے۔ اللہ کی زمین پر دندناتا پھرتا ہے۔ سرکشی کرتا ہے۔ وسائل کی قیمت لگاتا ہے۔ لیکن اللہ ہر قدم پر اسے یاد رکھتا ہے۔''

• • ———————— • •

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میں تربیت کے دور سے گزر رہا تھا۔ زندگی شکوک وشبہات، اور وسوسوں کی آماج گاہ تھی۔ یقین کے راستہ میں قدم بڑھایا تو بے یقینی کا طوفان حملہ آور ہوا۔ میں نے سوچا کہ طویل عرصہ اللہ کو پکارا، اللہ نے جواب کیوں نہیں دیا؟ راتیں آنکھوں میں سمیٹ لیں، کوئی کشف کیوں نہیں ہوا؟ مرشد کے اوپر میرا یہ حق ہے، وہ حق ہے، خدمت میں رات دن ایک کر دیئے لیکن؟ فلاں آدمی کیوں نواز دیا گیا، مجھے کیوں محروم رکھا گیا؟

پانی سر سے اونچا ہوا اور شیطان نے اپنا آلۂ کار بنا لیا تو مایوسی کے دورے پڑنے لگے۔

ایک دن مرشد کریم نے فرمایا: ''خواجہ صاحب بیٹھ جائیں۔''

پوچھا: ''میرا آپ سے رشتہ کیا ہے؟'' عرض کیا: ''آپ کا غلام ہوں۔''

فرمایا: ''یہ تو ٹھیک ہے، میں تمہارا کیا لگتا ہوں؟''

ڈرتے ڈرتے کہا: ''حضور! آپ میرے محبوب ہیں۔''

مسکرا کر فرمایا: ''لیجئے! یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ جب محبوب پاس ہو تو کیا کوئی اور خیال آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو یہ محبوب کی توہین ہے۔ اس لئے کہ اگر محبوب کی ہم آغوشی کے بعد کوئی خیال آتا ہے تو دراصل وہ محبوب ہے جس کا خیال آ رہا ہے۔ آپ جنت دیکھنا چاہتے ہیں، آسمانوں میں پرواز کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا محبوب میں کس طرح ہوا؟ آپ کا محبوب جنت ہے، پرواز ہے، کشف وکرامات ہیں۔''

میں لرز گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ دل کی دنیا ماتم کدہ بن گئی۔ تھکے قدموں سے اٹھا اور

مرشد کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ انہوں نے ایک آہ بھری اور مجھے سینہ سے لگا لیا۔

• • ———————— • •

محبوب کی وصل کی لذت آج بھی اندر میں زندہ ہے اور دن رات بے قرار کئے ہوئے ہے۔ اس لذت کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں پہنچا۔ جنت کا ایک ایک گوشہ دیکھا، آسمانوں کی رفعتوں میں فرشتوں کے خوش نما صفاتی پروں کا جمال دیکھا، ملائے اعلیٰ کے قدسی اجسام میں تجلی کا عکس دیکھا، دوزخ کے طبقات میں گھوم کر آیا، موت سے پنجہ آزمائی کی، وہ کچھ دیکھا جس کے لئے الفاظ نہیں ہیں کہ بیان کر دیا جائے لیکن مرشد کے وصل کی لذت نہیں ملی۔

ہر لمحہ مرنے کے بعد اس لئے جیتا ہوں کہ مرشد سے قربت ملے گی۔

جینے کے بعد ہر آن اس لئے مرتا ہوں کہ مرشد کا وصال نصیب ہوگا۔

اندر جھانکتا ہوں مرشد نظر آتے ہیں۔ باہر دیکھتا ہوں مرشد کی جھلک پڑتی ہے۔

ہائے! وہ کیسی لذتِ وصل تھی کہ زمانے گزرنے کے بعد بھی روح میں تڑپ ہے۔ اضطراب ہے۔ انتظار ہے۔ اس یقین کے ساتھ زندہ ہوں، اس یقین کے ساتھ مروں گا، اس یقین کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوں گا کہ مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ مجھے ایک بار سینہ سے لگائیں گے اور اس طرح اپنے اندر سمیٹ لیں گے کہ میرا وجود نفی ہو جائے گا۔ اور کوئی یہ نہیں جانتا کہ مرشد اور مرید دو الگ الگ پرت ہیں۔

اللہ حافظ

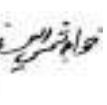

فقیر کی ڈاک

تفکر ـــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ غور وفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ـــ عرفان نفس اور معرفت الٰہی ہے۔ ''فقیر کی ڈاک'' اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کی پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

محترم خواجہ صاحب ـــ السلام علیکم،

میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا خواب ہر کس و ناکس کو بیان کرنا چاہئے یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آدمی خواب کیوں دیکھتا ہے اور خواب میں دیکھے ہوئے واقعات اور کئے ہوئے اعمال کیا واقعی کوئی اہمیت رکھتے ہیں؟

شکریہ، انجم باسط (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

بی بی! آدمی خواب کیوں دیکھتا ہے، اس کے جواب میں طویل تبصرہ درکار ہے۔ البتہ اختصار کے ساتھ دو ایک بنیادی باتیں تحریر کی جاتی ہیں۔ نوع انسانی جب سے حواس رکھتی ہے وہ کچھ نہ کچھ سوچنے سمجھنے اور نتائج نکالنے کی عادی ہے۔ آج تک شعور کی کوئی شاخ خواہ وہ فلسفہ ہو، طبیعیات ہو یا نفسیات، کائنات کی بنیاد موج امکانی (لازمانیت) کے علاوہ کسی چیز کو قرار نہیں دے سکی۔ کائنات کی بنیاد میں تصورِ شے کے علاوہ خود شے کی محسوسیت اور شے کے ٹھوس پن کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ شبیہیں اور تصورات ہیں جو ہمارے دماغ کی سطح پر بنتے ہیں۔ ہم ان شبیہوں اور تصورات کے علاوہ کسی اور حقیقت سے ناواقف ہیں۔

ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ خارجی دنیا میں وہ کون سے محرکات ہیں جو یہ شبیہیں نشر کرتے ہیں اور ان محرکات کی ماہیت کا بھی ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ بات نوع آدم کو معلوم نہیں ہوسکی کہ زمانی مکانی محل وقوع اور اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ چناں چہ یہ کہنا کہ انسان کے ذہن کو صرف خارجی دنیا کنٹرول کرتی ہے اور خارجی دنیا ہی دماغی سطح پر شبیہیں بناتی ہے، نیز حواس کا دروبست خارجی دنیا کے ہاتھ میں ہے، محض مغالطہ ہے کہ کائنات کی بنیاد

جب کہ موج امکانی ہے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ موج امکانی خارجی ہو سکتی ہے داخلی نہیں ہو سکتی ــــ؟

یہ بنیادی غلطی ہے کہ موج امکانی کو کسی دائرہ میں خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی محدود کر دیا جائے۔ بہرصورت ہمارے حواس کی ڈوری جہاں سے اپنی جنبش شروع کرتی ہے وہ لازمانیت ہے اور لازمانیت کا خارج اور داخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمارے لئے حواس کا محرک جس طرح ماضی ہو سکتا ہے جس کو ہم خارجی اور مظاہراتی دنیا کہتے ہیں، یہی حقیقت مستقبل کی ہے جس کو ہم غائب، نامعلوم اور داخلی دنیا کہتے ہیں۔ معلوم اور نامعلوم کے درمیان خود ہمارے حواس نے پردہ کھینچ دیا ہے۔ لازمانیت کا اس پردہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے حواس خواب میں بھی اسی طرح تحریک پاتے ہیں جیسے بیداری میں۔

آپ کا یہ سوال کہ خواب میں دیکھے ہوئے واقعات اور کئے ہوئے اعمال کیا واقعی اہمیت رکھتے ہیں۔

اس کا جواب سورۂ یوسف میں ہے جس میں چار خوابوں کا ذکر آیا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے کہا، اے میرے باپ میں نے خواب دیکھا ہے:

''سورج، چاند اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔''

اسی طرح جب حضرت یوسفؑ مصر میں قید تھے تو دو قیدیوں نے حضرت یوسفؑ کو اپنے خواب سنائے۔

ایک نے بتایا کہ میں نے غور سے دیکھا ہے کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔

دوسرے نے کہا، میں نے دیکھا ہے کہ میں سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔

قرآن کریم میں بیان کردہ چوتھا خواب بادشاہِ مصر کا ہے۔ بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں۔ سات دبلی گائیں سات موٹی گائیں کو نگل رہی ہیں۔ سات بالیں ہری ہیں، دوسری سات سوکھی بالیں۔ سات خشک بالیں سات ہری بالوں کو کھا رہی ہیں۔

غور طلب ہے کہ قرآن کریم میں بیان شدہ ان خوابوں میں ایک خواب پیغمبر کا ہے اور تین خواب عام لوگوں کے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حالات و واقعات اسی طرح پیش آئے جس طرح خوابوں میں نشان دہی کی گئی ہے۔

اس سوال (کہ خواب کسی شخص سے بیان کرنا چاہئے یا نہیں) کے جواب میں عرض ہے کہ خواب کبھی کسی ایسے شخص سے بیان نہیں کرنا چاہئے جو کم سے کم بھی خواب کی تعبیر اور خواب کی فطرت سے واقف نہ ہو ورنہ اس کا جواب یا اس کی دی ہوئی تعبیر یا اس کے الفاظ خواب دیکھنے والے کے ذہن کو غلط محرکات پر ڈال سکتے ہیں۔

دعا گو، عظیمی (8 دسمبر 1969ء)

نامے میرے نام

کرم فرما خواتین وحضرات نے ''ماہنامہ قلندر شعور'' کو دل کی گہرائیوں سے نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ قبول فرما کر روپ بہروپ کو دلہن کا روپ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قارئین کی خدمت کی توفیق دیں۔ رابطہ کے قدیم وجدید وسائل کے ذریعہ موصول ہونے والے خطوط میں سے منتخب خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔

اگست 2019ء کے ''آج کی بات'' پر خواتین وحضرات نے تفکر کیا۔ منتخب خطوط پڑھئے۔

عبدالرشید (سیالکوٹ): شیر اور نانا تاج الدینؒ کی ملاقات کا احوال جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے، ذہن میں نقشہ بن جاتا ہے۔ میں نے اس واقعہ کو ''آج کی بات'' میں پڑھا اور ذہن کی اسکرین پر دیکھا۔ شہنشاہ ہفت اقلیم نانا تاج الدینؒ جانتے تھے کہ شیر آئے گا۔ انہوں نے شیر کو لہروں کے ذریعے اپنی موجودگی کا پیغام دے دیا تھا۔ وہ شیر سے اور شیر ان سے واقف تھا کیوں کہ واقعہ بتاتا ہے کہ شیر پہلے کبھی زخمی ہوا تھا اور نانا تاج الدینؒ نے اس کا علاج کیا تھا۔ اس لئے فرمایا کہ اب تیری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ والے کے قدموں میں ایک درندہ کا بیٹھنا ـــ تسخیر کائنات کا علم ہے۔

بسمہ ساجد (کراچی): کائنات کی زبان انا کی لہریں ہیں۔ یہ فرد کے اندر موجود حرکت کرنے والے وجود کی لہریں ہیں۔ حرکت جس زبان میں ہوتی ہے، اسے الفاظ کی ضرورت نہیں، حرکت مطلوبہ فرد کی طرف متوجہ ہوکر خیال کو مرتکز کرتی ہے اور خیال پہنچ جاتا ہے۔ شہنشاہ ہفت اقلیم خیال کی کائناتی زبان سے واقف ہیں، شیر بھی کسی حد تک اس زبان سے واقفیت رکھتا ہے۔ اس نے نانا تاج الدینؒ کی لہروں کو قبول کیا اور جنگل میں ان کی موجودگی کا علم پاکر حاضر ہوگیا۔

وقاص احمد (متحدہ عرب امارات): لہریں کیا ہیں ـــ؟ ہر شخص لہروں سے بندھا ہوا ہے۔ یہ کیسی ڈور ہے؟ جسم سے بندھے ہوئے تار نظر نہیں آتے البتہ جب میں نے ان پر توجہ دی تو تاروں میں کرنٹ محسوس ہوا اور ہاتھوں میں سنسناہٹ پیدا ہوگئی۔ یہ کیسی زبان ہے اور اس کے حروف کیا ہیں؟ غور کرنے پر ذہن کھوجاتا ہے۔

رفیعہ تاج (کراچی): ہمیں جو خیالات آتے ہیں اور وہ خیالات جو ہم سے دوسروں کو جاتے ہیں، سب لہریں

ہیں۔اس کے بغیر ہماری حیثیت پتلے کی ہے جسے اپنی خبر ہے نہ کسی اور کا علم۔سورج مجھے اطلاع بھیجتا ہے، میں سورج کو اطلاع بھیجتی ہوں۔ میں نے جیسے ہی سورج کے بارے میں سوچا، انا کی لہروں نے سورج کو خبر دے دی اور وہ میری طرف متوجہ ہوگیا۔ان لہروں کی رفتار اتنی تیز ہے کہ سوچتے ہی ان کا مظاہرہ ہوجاتا ہے۔

سفیرہ محسن (لاہور): میرا خیال ہے کہ ادارہ کی جانب سے انا کی لہروں پر آسان پیرائے میں ایک مضمون آنا چاہئے۔جس میں اس سوال کا جواب بھی دیا جائے کہ پیغام کی ترسیل اور وصولی کے لئے انا کی لہریں ایک ہیں۔یہ کس کی انا کی لہریں ہیں جس کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔

واجد نیازی (نوشہرہ): انا کی لہروں کی رفتار قابل غور ہے۔سائنس دان روشنی کو تیز رفتار مانتے ہیں کیوں کہ ابھی وہ انا کی لہروں سے واقف نہیں ہیں۔یہ ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں تو ان کا علم سیکھ کر ہم جس وقت جہاں چاہیں موجود ہوسکتے ہیں۔تفکر کے دوران قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کے دربار میں موجود ''کتاب'' کا علم رکھنے والے بندہ کی ذہن میں تصویر بنی۔یقیناً اس نے انا کی لہروں کے ذریعے تخت 1500 میل دور سے حاضر کردیا۔

محمد سلیمان (کراچی): ''کائنات میں ایک شعور کارفرما ہے۔'' اس شعور میں تغیر نہیں ہے اس لئے جب حرکت ہوتی ہے تو وہ ہر مقام اور ہر زون میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ سننے اور محسوس کرنے کی فریکوئنسی جتنی تیز ہوگی، ہم اتنی زیادہ اطلاعات وصول کریں گے۔اللہ نے ہر فرد کو دین فطرت پر پیدا کیا ہے۔کیا دین فطرت انا کی لہریں ہیں؟

غیاث الدین (شہر کا نام نہیں لکھا): ہم سب اپنی اپنی انا میں گرفتار ہیں اور ہماری انا فکشن ہے۔کائنات کی بھی انا ہے اور یہ ''انا'' ہم سب میں موجود وہ ہستی ہے جس نے ہمیں حواس عطا کئے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں سماعت، بصارت اور سوچنے والے دل دیئے پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟

صائمہ نصیر (فیصل آباد): عظیمی صاحب ابا جی نے ہمیشہ کی طرح ''آج کی بات'' میں بہت سے اسرار و رموز بیان کئے ہیں۔کائناتی نظام انا کی لہروں پر قائم ہے۔ایک مخلوق دوسری مخلوق سے انا کی لہروں کے ذریعے رابطہ میں ہے۔انا کی لہریں نور کی طرح لطیف ہوتی ہیں اور نور کا کوئی شرق ہے نہ غرب۔نور (کرنٹ) اور انا کی لہریں کائنات میں اور ہر مخلوق کے اندر موجود ہیں۔یہ پلک جھپکنے سے پہلے کام کرتی ہیں۔جیسے حضرت سلیمانؑ کے دربار میں صاحبِ علم بندہ آصف بن برخیا پلک جھپکنے سے پہلے تخت لے آیا۔

★ —— ★ —— ★

مضامین پر موصول تفکر اور تبصروں میں چند پیش خدمت ہیں۔

شاہانہ طارق (لاہور): پیراسائیکالوجی کی تفہیم علمی اور معلوماتی ہے۔خلاصہ لکھنے سے مضمون کا مرکزی خیال واضح ہوجاتا ہے اس لئے خلاصہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔اس کو کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جانا چاہئے۔تحریر میں رموز ہیں۔قرآن کریم کی آیات اور بزرگوں کے واقعات کو جس طرح پیراسائیکالوجی کے تناظر میں سمجھایا گیا ہے، اس نے سوچ کو نیا رخ دیا ہے۔پڑھ کر لگتا ہے کہ خیال بذات خود پیراسائیکالوجی ہے۔

سلیم حیدر (فیصل آباد): محترم عظیمی صاحب، مہربانی فرما کر ان باتوں پر روشنی ڈالئے۔

۱۔توبہ کرنے کا سہل ترین طریقہ کیا ہے؟ ۲۔ایسا کیا طریقہ ہوسکتا ہے کہ مرید اپنے مرشد کی آنکھ کا ستارا بن جائے؟

★ **غلطی کا اعتراف کر کے پختہ ارادہ کیا جائے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔**

★ **ستارے سے واقفیت نہ ہو تو یہ پوچھنا کیا صحیح بات ہے؟**

وجیہ مشتاق (کراچی): مضامین کے آخر میں نظمیں، غزلیں، چھوٹے چھوٹے واقعات اور معلومات کا انتخاب عمدہ ہے۔میں نے اس رسالہ میں کبھی کوئی بے مقصد اور فضول تحریر نہیں دیکھی۔صاف الفاظ، شفاف سوچ۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ رسالہ گھر گھر پہنچے اور لوگ اس علم کی قدر کریں، آمین۔

خالد رانا (ملتان): مضامین کا معیار بڑھ گیا ہے۔نئے لکھنے والے بہت خوب لکھ رہے ہیں۔بے شک اس میں ادارہ کی محنت شامل ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ اس کے معیار کو ایسے مقام پر پہنچایا ہے کہ اس پر ریسرچ کی جاسکتی ہے۔آسان الفاظ میں مشکل بات کو سمجھانا آسان نہیں ہے لیکن مضامین میں مختلف زاویوں سے سمجھا کر اسے آسان بنا دیا جاتا ہے۔اگر کبھی مضامین کے موضوع ایک ہوجائیں تو یکسانیت محسوس نہیں ہوتی۔سمجھنے کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں۔گزارش ہے کہ ''آج کی بات'' کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

اسد شیخ (کراچی): آدم ڈے کے حوالہ سے خصوصی تحریر پڑھی۔عمیق اور جامع موضوع رکھا گیا کہ کس طرح اطلاع کے نظام پر عمل کر کے نوع آدم ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوسکتی ہے۔روشن دماغ لوگ اس مضمون سے ضرور متاثر ہوں گے۔میں نے اپنے دوست سے ذکر کیا تو وہ مرکزی خیال سے بہت متاثر ہوا اور مضمون پڑھ کر کہا کہ بھائی! ایسی بات میں نے آج تک نہیں سنی اور نہ پڑھی ہے۔وہ کہتا ہے کہ یہ عالمگیر ذہن کی سوچ ہے۔

بی بی مریم (کراچی): حج کے موقع پر دل کو چھونے والی تحریر ''لبیک اللھم لبیک'' شائع ہوئی۔حقوق العباد کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ہستی کتنی خوب صورت، عظیم، مہربان اور رحیم ہے کہ اللہ نے حقوق اللہ کے مقابلہ میں حقوق العباد کو اولیت دی ہے۔اس میں حکمت ہے کہ حقوق العباد ہی حقوق اللہ ہے۔

عابد حسین (گجرات): اولیاء اللہ محبت کی تعلیم دیتے ہیں اسی لئے ہر فرد کھچا چلا آتا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کا ہر مذہب کے لوگ احترام کرتے ہیں۔ مہاراجا کشن پرشاد کا سفرنامہ ناگپور اللہ کے دوستوں سے عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔ اگست کی مناسبت سے اچھا اضافہ تھا۔

کلثوم (کراچی): ''مقداریں کیا ہیں'' میں بلی والا واقعہ پڑھنے کے بعد مجھے اپنے اردگرد بہت ساری چیزیں سمجھ میں آنے لگیں۔ سوال کیا گیا ہے کہ اپنی مقدار کو چھوڑ کر ہم نے کون سی مقدار کو قبول کیا ہے؟ ہم نے ان کی مقداروں کو قبول کیا ہے جن کو ہم جانور کہتے ہیں جب کہ .....؟

سید شعیب (کراچی): ''لکیروں میں مفہوم'' میں لکھا ہے کہ'' بکری کو معلوم ہے کہ لوگ اسے بکری کہتے ہیں؟ پھر بکری بولنے پر وہ ہماری طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتی؟ اگر متوجہ ہوتی ہے تو اس کی وجہ آواز ہے، اسے بکری پکارنا نہیں۔'' یعنی سارے نام فرضی ہیں۔ ہم فرض کی ہوئی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ یہ بات ذہن کو اتھل پتھل کر دیتی ہے۔

شائستہ مکرم (کراچی): بچوں کی لوریاں ہلکی پھلکی اور منفرد تحریر ہے۔ پڑھ کر میں بچپن میں چلی گئی۔ لوری شاید آواز میں ایسا تاثر ہے جس سے سکون کی لہریں طاری ہو جاتی ہیں۔ ہاتھی نے بھی اس اثر کو قبول کیا۔

عظمیٰ (حیدرآباد): ''مرغی نے خواب دیکھا'' اچھی کہانی ہے۔ بچوں کے لئے ان کہانیوں کو کتابی شکل میں شائع کریں کیوں کہ بچوں کا معیاری ادب ناپید ہو رہا ہے۔ شائستہ زبیر کی چھوٹی اور پیاری سی کہانی پر انہیں شاباش۔

زینت خاتون (راولپنڈی): میں جاننا چاہتی ہوں کہ کسی تحریر کو صحیح طرح سے پڑھنے کا طریقہ کیا ہے تاکہ فرد حکمت سے واقف ہو جائے۔ ★ ذہنی یکسوئی سے بڑی سے بڑی گتھی سلجھ جاتی ہے۔

محترم خواتین و حضرات

عرض ہے کہ مہنگائی سے روزمرہ ضروریات کی طرح کاغذ کی قیمت اور پرنٹنگ کے اخراجات میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بہ امرِ مجبوری اکتوبر 2019ء سے ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے ہدیہ میں فی شمارہ دس روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یقین ہے کہ روحانی علوم کو پھیلانے میں ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی آپ کا تعاون شاملِ حال رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور باطنی علوم کا فہم عطا فرمائے، آمین۔ (ادارہ)

حامد ابراہیم

قُوت لایموت

دوپہر اور سہ پہر کے اوقات میں یہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور مٹی ریت کے مفید ذرّات کو فضا میں بلند کرتی ہے۔ یہ ذرّات اپنے منبع سے اڑ کر تقریباً آٹھ ہزار کلومیٹر کا سفر کرتے ہوئے شمال مغربی افریقا اور بحرِ اوقیانوس پار کر کے امیزون میں گرتے ہیں اور حیات کے لئے قُوت لایموت کا سامان بنتے ہیں۔

ایک اندازہ کے مطابق پاکستان کے کُل رقبہ کا 45 فی صد علاقہ زراعت کے لئے موزوں ہے۔ اگر آب پاشی کے نہری نظام اور دیگر ذرائع میں جدید اصلاحات کی جائیں اور زرعی ٹیکنالوجی میں جدت لائی جائے تو مذکورہ رقبہ میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

کوہستانِ نمک سے جنوب کی سمت ملتان تک کا علاقہ دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ہے۔ وسطی پنجاب میں پیدا ہونے والے باسمتی چاول، گندم، کماد (گنّا) اور متفرق انواع کی دوسری فصلوں کو معیار اور ذائقہ کے لحاظ سے دنیا اعلیٰ و عمدہ قرار دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ citrus خاندان کے پھل اور پاکستانی آموں کا معیار دنیا بھر میں بہترین ہے۔

موسمی اجناس ہوں یا پھل دار فصل — بھرپور پیداوار کے لئے ضروری ہے کہ فصل کے اعتبار سے زمین کی معدنی اور نامیاتی ضروریات پوری کی جائیں۔ قدرتی اور مصنوعی کھاد مطلوبہ مقدار میں مہیا کی جائے اور فصل کو بروقت پانی دیا جائے وغیرہ۔ علاوہ ازیں محنت و مشقت بھی درکار ہے۔

زمینی مدار میں موجود مصنوعی سیاروں کی مدد سے زمین کی جو تصاویر حاصل کی گئی ہیں ان میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ سبز رنگ کے علاقے زمین کی زرخیزی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں نسبتاً سب سے وسیع اور زیادہ سرسبز علاقہ جنوبی امریکا کی وادی ''امیزون'' ہے۔

وادی امیزون — امیزون کے وسیع و عریض جنگل اور اس کے روح رواں دریائے امیزون پر مشتمل ہے۔ وادی کا رقبہ تقریباً 5 5 لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اتنے بڑے رقبہ میں زیادہ تر برازیل، پیرو، کولمبیا، وینزویلا، ایکواڈور، بولیویا، گیانا، فرانسیسی گیانا اور سُوری نام کے حصے شامل ہیں۔ تحقیق کے مطابق زمین پر موجود نباتات اور حیوانات کی تمام اقسام میں سے کم از کم

نصف اقسام اس علاقہ کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔

قارئین کرام! اتنے بڑے رقبہ پر مشتمل انتہائی گنجان حیاتیاتی نظام (ecosystem) کی غذائی ضروریات کس طرح پوری ہوتی ہیں؟

حیوانات اور حشرات کا دارومدار نباتات پر ہے۔ امیزون میں موجود لاکھوں کروڑوں صحت مند، تناور اور جسیم درخت، جھاڑیاں، جڑی بوٹیاں، گھاس اور جتنی اقسام کے نباتات موجود ہیں سب کو نشوونما کے لئے معدنیات، نائٹروجن، پوٹاشیم، فاسفورس، کلورائیڈ وغیرہ کی فراہمی ضروری ہے۔ صرف دریائے امیزون کا پانی اور بارشیں علاقہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

اس ترقی یافتہ دور میں وادی امیزون کے لئے اتنی بڑی مقدار میں معدنیات اور کھاد مہیا کرنا اور پورے علاقہ میں بقدر ضرورت بکھیرنا ناممکن ہے۔ اس کے باوجود امیزون کا علاقہ تاحال سرسبز و شاداب اور قائم و دائم ہے۔ قدرت نے اس کا کیا انتظام کیا ہے؟

وادی امیزون سے مشرق کی طرف بحرِ اوقیانوس کے پار براعظم افریقا ہے۔ یہاں صحرائے اعظم ''صحارا'' کے جنوب مشرق میں نشیبی صحرائی علاقہ ہے جسے بوڈیل ڈپریشن (Bodele depression) کہتے ہیں۔ یہ ملک چاڈ میں واقع نشیبی صحرائی علاقہ ہے اور لیبیا کے جنوب میں ہے۔ ماہرین ارضیات کے مطابق اس جگہ کئی ہزار سال پہلے چھوٹا سمندر تھا جس طرح آج ایران کے شمال میں بحیرہ قزوین (Caspian sea) ہے۔ جب یہ سمندر خشک ہوا تو مردہ آبی حیات جیسے مچھلیاں، نباتات اور پلانکٹن وغیرہ کی باقیات وقت گزرنے کے ساتھ تحلیل ہوکر ذرّات میں تبدیل ہوگئیں۔ چناں چہ اس صحرائی علاقہ کی ریت نباتات کے لئے مفید معدنیات (فاسفورس، پوٹاشیم، نائٹروجن اور لوہا وغیرہ) سے بھرپور ہے۔

اللہ رب العالمین ہیں، خیر الرازقین ہیں اور جسے چاہیں بے حساب رزق عطا فرماتے ہیں۔ روزانہ معمول کی طرز پر دوپہر اور سہ پہر کے اوقات میں یہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور مٹی ریت کے ان مفید ذرّات کو فضا میں بلند کرتی ہے۔ یہ ذرّات اپنے منبع سے اڑ کر تقریباً آٹھ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے شمال مغربی افریقا اور بحرِ اوقیانوس پار کر کے امیزون میں گرتے ہیں اور حیات کے لئے قُوت لایموت * کا سامان بنتے ہیں۔

جب امیزون میں برسات کا موسم ہوتا ہے تو یہاں سے مشرق کی طرف صحارا کے خطہ میں گردوغبار کے عظیم طوفان اٹھتے ہیں جو کئی سو کلومیٹر وسیع اور 100 منزلہ عمارت سے زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ یہ طوفان

* قُوت لایموت (اس قدر خوراک جو خاکی جسم کا نظام قائم رکھنے کے لئے کافی ہو)

افریقا کے مغربی ساحل تک پہنچتے پہنچتے فضا میں مزید کئی کلومیٹر بلند ہوجاتے ہیں اور بحرِ اوقیانوس پار کرتے ہوئے امیزون کے اوپر موجود گھنے برساتی بادلوں سے ٹکراتے ہیں۔اس طرح بارش کی شکل میں پورے امیزون میں نشوونما اور افزائش کے لئے ضروری معدنیات وافر مقدار میں برستے ہیں۔

برساتی موسم کے اختتام پر سورج آب وتاب سے نکلتا ہے تو ان معدنیات کی بدولت بے شمار انواع و اقسام کے نباتات کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ جہاں ایک پتّا ہے وہاں تین پتّے اور نکل آتے ہیں۔اس طرح امیزون کا حیاتیاتی نظام اپنے شباب پر لوٹ آتا ہے۔

مصنوعی سیاروں کی مدد سے لگائے گئے اندازوں کے مطابق صرف ایک دن میں 54 ہزار ٹن گرد وغبار کے ذرّات آٹھ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے امیزون پہنچتے ہیں۔مضمون میں دی گئی تصویر دیکھئے۔

یہ محض ایک عمل کا احوال ہے جو کرۂ زمین کے متحرک نظام کو جاری وساری رکھنے کے لئے اس جیسے ہزاروں عوامل کا حصہ ہے۔ وسائل کی فراہمی کا یہ نظام مٹی کے ذرّات کو (جو زندگی کو قائم رکھنے کی مقداروں پر مشتمل ہے) کرۂ زمین کے تمام حصوں تک پہنچانے اور تقسیم کرنے کا ذمہ دار ہے۔

صحرا، پہاڑ اور زرخیز میدان سب مٹی کے ذرّات سے مل کر بنے ہیں۔ ذرّات میں مقداروں کی ترکیب

مختلف ہے۔مختلف تراکیب جب آپس میں ملتی ہیں تو زندگی نئے نئے لباس زیب تن کرتی ہے۔

زمین کے ہر خطہ میں مٹی کے ذرّات کی ترکیب دوسرے خطہ سے مختلف ہے لیکن جس خطہ میں جن مقداروں کی ضرورت پڑتی ہے، وسائل کی ترسیل کا یہ حیرت انگیز قدرتی نظام ان مقداروں کو وہاں پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے۔

شمالی امریکا کے وسیع زرعی میدان دور دراز گلیشیئرز سے لائے ہوئے ذرّات کی بدولت زرخیز ہیں۔گندم اور مکئی کی ریکارڈ پیداوار یہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش میں دریائے گنگا کا ڈیلٹا لوہے کے معدنی مرکبات سے پُر ہے جو ہمالیہ کی بلند چٹانوں سے طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہیں اور چاول کی فصل اگانے کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔

زمین کے دوسرے حصوں میں کہیں برف اور کہیں ہوا کے ذریعے ذرّات کی ترسیل جاری ہے۔ براعظم

انٹارکٹیکا پر جب چھ مہینے کی طویل شب کا آغاز ہوتا ہے تو براعظم کے اردگرد بحرِ جنوبی منجمد ہونا شروع ہوتا ہے۔ سمندر کا پانی جمتا ہے تو اندر موجود نمک کے ذرّات خارج کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران نمک کے ذرّات پانی سے بالکل جدا نہیں ہوتے بلکہ انتہائی مرتکز (concentrated) محلول کی صورت میں باقی رہ جانے والے پانی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ محلول کی شکل میں ذرّات سمندر کی سطح سے نیچے کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔ بحرِ منجمد جنوبی کی سطح سے خارج ہونے والے نمک کے ذرّات کا مرتکز محلول، پانی کے اندر نیچے کی طرف عظیم آبشار کی صورت میں سفر کرتا ہے۔

ارضیاتی ماہرین کے مطابق یہ عظیم آبشار جو انتہائی خاموشی اور تاریکی میں زیرِ سمندر بہتی ہے، اس کے حجم اور مقدار کا صحیح اندازہ محال ہے۔ اس آبشار میں نمک کے ذرّات آکسیجن کے ذرّات (مالیکیولز۔ سالمات) کے ساتھ چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سمندر کے پیندے میں سینکڑوں کلومیٹر تک پھیل جاتے ہیں۔ سمندری رو جب چلتی ہیں تو آکسیجن اور نمکیات سے بھرپور ان ذرّات کو دنیا کے تمام سمندروں میں ترتیب سے بکھیر دیتی ہیں۔ ایک طرف سمندری حیات کو درکار ضروری آکسیجن اور نمکیات و معدنیات مہیا ہوتے ہیں، دوسری طرف یہ وہاں کے پانی کا درجۂ حرارت متوازن رکھتی ہیں۔

اس طرح کے ہزاروں حیرت انگیز عوامل ظاہر کرتے ہیں کہ زمین جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا، زندہ متحرک وجود ہے، قدرت زمین کا نظام قاعدہ اور ترتیب سے چلاتی ہے اور اس نظام کی دیکھ بھال اور مرمت بھی کرتی ہے۔ وسائل کی تقسیم میں ذرّات کا کردار انتہائی اہم اور بنیادی ہے۔ اگر ابنِ آدم زمین کے نظام اور تشخص سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اسے ذرّہ کے تشخص اور میکانزم سے واقف ہونا پڑے گا۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''زمین بھی ظاہر الوجود اور باطن الوجود کے غلاف میں بند ہے۔ زمین جب ظاہر الوجود ہے تو ٹھوس ہے اور جب باطن الوجود ہے تو خلا ہے۔ ظاہر الوجود زمین کششِ ثقل ہے اور باطن الوجود روشنی ہے۔

زمین بھی عقل و شعور رکھتی ہے۔ وہ ادراک بالحواس بھی ہے۔ زمین یہ جانتی ہے کہ انار کے درخت میں امرود نہیں لگے گا اور امرود کے درخت میں انار نہیں لگے گا۔ وہ مٹھاس، کھٹاس، تلخ اور شیریں سے بھی واقف ہے۔ اس کے علم میں یہ بات بھی ہے کہ کانٹے بھرے پودے میں پھول زیادہ حسین لگتا ہے۔ کانٹے سے بغیر پودے میں کتنا ہی خوش رنگ پھول ہو، پھول میں کتنے ہی رنگوں کا امتزاج ہو لیکن پھول کی قیمت وہ نہیں جو کانٹوں کے ساتھ لگے پھول میں ہوتی ہے۔ زمین اس بات کا بھی علم رکھتی ہے کہ اس کی کوکھ میں رنگ برنگ، قسم قسم

بیجوں کی نشوونما ہوتی ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے،

'اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کی ہیں، ان میں غوروفکر کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔' (النحل: ۱۳)

زمین جہاں بے شمار رنگوں سے مزین پھول پیدا کرتی ہے، تلخ وشیریں پھل اگاتی ہے، پرندوں، چوپایوں کی تخلیق کرتی ہے، وہاں اپنی حرکت کو متوازن رکھنے کے لئے پہاڑ بھی بناتی ہے۔لیکن یہ میلوں میل طویل اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے بلند وبالا پہاڑ جب ظاہرالوجود میں نظر آتے ہیں تو زمین پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں اور جب باطن الوجود پہاڑ دیکھے جاتے ہیں تو اڑتے ہوئے بادل دکھائی دیتے ہیں۔ظاہرالوجود پتلا نہیں تھا تب بھی زمین تھی۔ظاہرالوجود پتلا نہیں ہوگا تب بھی زمین رہے گی۔ظاہرالوجود ایک ذرّہ تھا، ذرّہ میں دوسرا ذرّہ شامل ہوا تو ذرّات ایک سے دو ہوئے اور ذرّات کی تعداد اتنی بڑھی کہ ایک وجود بن گیا۔قلندر دو حروف جانتا ہے اور وہ دو حروف یہ ہیں: کوئی نہیں، کبھی نہیں۔دانش ور، علامہ، مفتی، مشائخ کہتے ہیں لفظ دو ہیں: نفی، اثبات۔قلندر کہتا ہے کہ اثبات نہیں صرف نفی ہی مادہ کی اصل ہے۔''

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ نے اس عمل کو مثال سے سمجھایا ہے۔وہ فرماتے ہیں،

''آیئے! تجزیہ کریں تاکہ تجزیہ مشاہدہ بن جائے۔ سامنے مٹی کا ایک ڈھیلا ہے اس کا وزن دو کلو ہے۔اس دو کلو وزنی ڈھیلے کو کسی آدمی کی کمر پر مارا جائے تو چوٹ لگے گی۔مٹی کے ڈھیلے کو پیس کر ذرّات میں تبدیل کرلیں۔سوال یہ ہے کہ دو کلو وزن کدھر گیا؟ کیا اس پسے ہوئے ڈھیلے کے ذرّات کو کسی کی کمر پر مارا جائے تو چوٹ لگے گی؟ تجربہ شاہد ہے کہ چوٹ نہیں لگے گی۔مشاہدہ یہ بھی ہے کہ مٹی کے ڈھیلے کو کتنا ہی پیس لیا جائے، ذرّات موجود رہیں گے اور کسی طریقہ پر ان ذرّات کو پھر ایک جگہ کردیا جائے اور کسی آدمی کی پشت پر مارا جائے تو چوٹ لگے گی۔حقیقت یہ ہے کہ بہت زیادہ ذرّات کا جمع ہونا، ایک دوسرے میں پیوست ہوجانا یا باہم دیگر ہم آغوش ہوجانا کشش ثقل یعنی اثبات ہے اور ظاہرالوجود ہے۔ظاہرالوجود تو رہے گا مگر ظاہرالوجود کی اصل یا بنیاد فنا ہے۔قلندر جب فنائیت کا ذکر کرتا ہے تو وہ ظاہرالوجود کی نفی کرتا ہے۔کیوں نفی کرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی نظر باطن الوجود کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتی۔''

محترم قارئین! آپ نے ''فقیر'' کی الہامی شعور پر مبنی بصیرت افزا تحریر کا مطالعہ کیا۔تحریر میں مخفی رموز محققین، دانش وروں اور مفکرین کے لئے مادی شعور کی بھول بھلیوں سے نکلنے اور حقیقت شناس فہم سے واقف ہونے کے لئے مشعل راہ ہیں۔

ماہرین فلکیات جب بڑی بڑی رصدگاہوں میں جدید دوربینوں اور کمپیوٹر کی مدد سے خلا میں جھانکتے

ہیں تو انہیں خلا کی وسعتوں میں ستاروں اور سیاروں کے علاوہ جو واضح اور اہم ترین وجود نظر آتا ہے وہ مٹی کے ذرّات کے انتہائی وسیع وعریض بادل ہیں اور نیبولا (nebula) کے نام سے معروف ہیں۔

محققین کہتے ہیں کہ ذرّات چکر کھا کر ایک مرکز میں جمع ہوتے ہیں تو حرارت کششِ ثقل کے زیر اثر کسی بڑے جسم، سیارہ، ستارہ یا شہابیہ کو تشکیل دیتی ہے۔

لیکن یہ سوال اہم ہے کہ گرد وغبار، گیسوں اور مٹی کے ذرّات پہلے سے وہاں کس طرح موجود ہیں؟ یہ کیسے وجود میں آئے؟ ان ذرّات کی تخلیق کا سورس کیا ہے؟ محققین نے ذرّات کو مزید ذرّوں میں تقسیم کیا حتیٰ کہ ایٹم کا نظریہ سامنے آیا۔ ایٹم جن ذرّات پر مشتمل ہے ان کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی لیکن بات مٹی کے ذرّہ سے آگے نہیں بڑھی۔

عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''آپ یہ نہ سمجھئے کہ ایٹم مٹی کا ذرّہ نہیں ہے۔ ایٹم بھی مٹی کا ذرّہ ہے۔ جب محققین نے تفکر کے ساتھ جدوجہد کی تو مٹی کا وہ ذرّہ جس کا نام ایٹم ہے، بول اٹھا کہ میرے اندر عظیم طاقت چھپی ہوئی ہے۔''

دور حاضر کے محقق نے مادہ کی اکائی، ذرّہ کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن ظاہر پر تکیہ کرنے کی وجہ سے وہ ذرّہ کے باطن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جب تک باطن میں غور نہیں کرے گا، تحقیق میں تخریب کا عنصر غالب رہے گا۔

بحیرہ قزوین

بحیرہ قزوین رقبہ اور حجم کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی سمندر نما جھیل ہے۔ اسے بحیرہ کیسپین اور دریائے خزر بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رومی جب یہاں آئے تو انہوں نے اس سمندر کا نام وہاں آباد قبیلہ کیسپین کے نام پر رکھ دیا۔ بحیرہ قزوین ایشیا اور یورپ کے درمیان چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا خطۂ آب ہے۔ رقبہ تین لاکھ 71 ہزار مربع کلومیٹر اور حجم 78 ہزار 200 مکعب کلومیٹر ہے۔ زیادہ سے زیادہ گہرائی 1025 میٹر (تین ہزار 363 فٹ) بتائی جاتی ہے۔

اس سمندر کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے مختلف حصوں کا موسم الگ الگ ہے۔ بحیرہ قزوین کا ساحل ایران، آذربائیجان، روس، ترکمانستان اور قازقستان سے لگتا ہے۔ آذربائیجان کا دارالحکومت باکو اس کے کنارے پر ہے۔

بحیرہ قزوین نمکین جھیل ہے، پانی میں کھارے پن کا تناسب 1.2% ہے جو عام سمندروں کی ایک تہائی مقدار ہے۔ اس میں گیس اور تیل کے ذخائر اور انواع و اقسام کی آبی مخلوقات ہیں۔ ان میں ایک اسٹراجن مچھلی ہے جس کی بیش تر اقسام کے انڈوں سے قدیم غذا خاویار* (caviar) بنائی جاتی تھی جو بادشاہ اور امرا شوق سے کھاتے تھے۔ اب اسٹرجن مچھلی کی تعداد میں خطرناک حد تک کمی آئی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی نے سمندر کے مکینوں پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔

---

* خ اوی ار

مسائل کا حل

''ماہنامہ قلندر شعور'' میں ''خواب کی تعبیر'' کے مقبول سلسلہ کے علاوہ پیراسائیکالوجی طریقِ علاج کے تحت مسائل کے حل کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اگر آپ کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہیں تو ادارہ کو خط لکھ سکتے ہیں۔ خط کے ساتھ ٹوکن منسلک ہونا ضروری ہے۔ انشاءاللہ ــــ اگلی قسط میں ٹوکن شائع کیا جائے گا۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ پڑھئے ــــ خیال میں وہ سب موجود ہے جو کائنات میں ہے۔ کائنات کی ابتدا ارادہ سے ہوئی اور ارادہ کائنات میں خیال کی ابتدا ہے۔ آدمی ایجادات کے لئے پہلے سے موجود ''وسائل'' سے مدد لیتا ہے۔ وسائل کو محض مادی اشیا سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے بنیادی وسیلہ خیال ہے۔ سننا دیکھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، لکھنا پڑھنا، غور کرنا ــــ خیال کے تابع ہے۔ خیال پر عمل کو فرد جب اپنے ارادہ سے منسوب کرتا ہے تو مسائل شروع ہوتے ہیں۔ مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ذہن رک گیا ہے۔

زندگی تین معین دائروں میں گزرتی ہے۔ ۱۔ فزکس ۲۔ سائیکالوجی ۳۔ پیراسائیکالوجی

فزکس ــــ وسائل کی دنیا ہے۔ فرد وسائل استعمال کرتے ہوئے جن تجربات سے گزرتا ہے وہ سائیکالوجی ہے۔ وسائل اور ان کی طرف متوجہ ہونے کا خیال جہاں سے آرہا ہے وہ علم پیراسائیکالوجی ہے۔ شے کی طرف متوجہ ہونے سے شے کی خصوصیات منتقل ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس فرد خیال کے سورس، خیال کی تحریکات اور خیال کے نظام پر متوجہ ہوجائے تو ذہن شکوک وشبہات اور ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ توجہ کی مدد سے فرد طبیعیات (فزکس) میں رہتے ہوئے پیراسائیکالوجی کے زون میں داخل ہوتا ہے۔

اس قسط میں آپ پڑھیں گے کہ ''میں کون ہوں'' کی تلاش فرد کو مشیتِ الٰہی سے متعارف کراتی ہے۔

خود پر تفکر کیا جائے تو پہلا سوال سامنے آتا ہے کہ میں کون ہوں ــــ کہاں سے آیا ہوں ــــ جہاں سے آیا ہوں، وہاں کیا ہے ــــ وہاں سے یہاں آنے کا محرک کیا بنا ــــ میں وہاں کس حال میں تھا ــــ جس نے مجھے تخلیق کیا وہ مجھے نظر کیوں نہیں آتا ــــ میرے اندر کامیکانزم کیسے کام کرتا ہے ــــ میں اطلاع کس طرح قبول کرتا ہوں ــــ اطلاع قبول کرنے والا کیا میں ہی ہوں ــــ کیا میں اندر میں اور باہر ایک ہوں ــــ اگر

ایک ہوں تو ایک فرد کے دو رخوں کا سبب کیا ہے اور ان دونوں میں سے میں کون ہوں — جب میں سوتا ہوں تو میرا جسم بیڈ پر ہوتا ہے اور میں آسمانی دنیا میں ہوتا ہوں۔ جسم کیا ہے اور آسمانی دنیا میں کون ہے —؟

علمِ مابعد النفسیات میں جاننے کی دو طرزیں ہیں۔

★ ایک طرز یہ ہے کہ روحانی استاد تصرف سے شاگرد کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ تجربات کرے۔ ایسے شاگرد کی حیثیت ان معنوں میں کم زور ہوتی ہے کہ اگر تجربہ غلط ہو جائے تو شاگرد بے بس ہو جاتا ہے۔

★ علم جن قوانین اور فارمولوں پر قائم ہے، اگر مرشد مرید کو فارمولوں کا علم اور علم میں تصرف کرنا سکھا دے تو مرید کے اندر تسخیر کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔

خالق کائنات فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب مسخر کر دیا۔

قرآن میں تسخیر کے عمل کا تذکرہ دو طرزوں میں ہے۔

① ایک طرز میں آدمی میں اچھائی اور برائی کا تصور کسی نہ کسی طرح اپنی ذات کے گرد گھومتا ہے۔

② دوسری طرز یہ ہے کہ آدمی کے ذہن میں اپنی ذات نہیں رہتی، وہ اپنی نفی کر دیتا ہے اور اس کا ذہن اللہ تعالیٰ کے اس قانون کو سمجھ لیتا ہے جس کو ''مشیت'' کہا گیا ہے۔

مشیت کیا ہے —؟ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ میں اس کا تذکرہ ہے۔

''اور وہاں انہوں نے ہمارے بندہ میں سے ایک بندہ کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے علمِ لدنّی عطا کیا تھا۔ موسیٰؑ نے اس سے کہا، کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟ اس نے جواب دیا، آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟ موسیٰؑ نے کہا، انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا، اچھا۔ اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں۔ اب وہ دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ اس شخص نے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا۔ موسیٰؑ نے کہا، آپ نے اس کا تختہ اکھاڑ دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں۔ یہ تو آپ نے سخت حرکت کی۔ اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ موسیٰؑ نے کہا، بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیئے۔ میرے معاملہ میں سختی سے کام نہ لیں۔ پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا، آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالاں کہ اس نے کسی کا خون نہیں کیا تھا۔ یہ کام آپ

نے بہت برا کیا۔ اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟ موسیٰؑ نے کہا، اس کے بعد اگر میں کچھ پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا۔ پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ مگر انہوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے والی تھی۔ اس شخص نے اس دیوار کو بنا دیا۔ موسیٰؑ نے کہا، اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے۔ اس نے کہا، بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں۔ کیوں کہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا تو اس کے والدین مومن تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے انہیں تنگ کرے گا۔ اس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلہ ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لئے خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔'' (الکہف: ۶۵۔۸۲)

خالق کائنات اللہ چاہتا ہے کہ

نوع آدم اس راستہ پر چلے جو قدم بقدم چلا کر بندہ کو اللہ تک لے جاتا ہے۔ خالق اپنی مخلوق سے یہ چاہتا ہے کہ مخلوق روزِ ازل کے جس عہد کو بھلا چکی ہے، اس کی تجدید کرے — خالق کی آواز سن کر، اس کی ربوبیت کا اقرار کر کے، اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرے۔ نوع آدم کے ذہن میں راسخ ہو جائے کہ ہمارا پیدا کرنے والا ہمارا رازق ہے، ہماری حفاظت کرتا ہے، ہمارا نگہبان ہے اور زندہ رکھنے کے لئے تمام وسائل فراہم کرتا ہے۔

اتنے مربوط اور منظّم انتظام کے ساتھ مخلوق کی نگہداشت اور نگہبانی کا منشا یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے بندہ کے ذہن پر منکشف ہو جائے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو محبت کے ساتھ پیدا کیا۔ جس طرح اللہ نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا اسی طرح مخلوق بھی محبت کے ساتھ اللہ کی قربت حاصل کرے۔

اس زمین پر زندگی کا جو رخ غالب ہے، وہ فریب

نظر ہے۔ جو ہوتا ہے وہ نظر آتا نہیں، جو نہیں ہوتا وہ نظر آجاتا ہے۔ زمین پر آنا، یہاں مختلف کرداروں میں پابند ہوکر وقت گزارنا اور پھر یہاں سے چلے جانا — اُس پروگرام کے مطابق ہے جو خالق کائنات نے زمین کے لئے متعین کیا ہے۔ آنے جانے اور مختلف کرداروں کے عمل میں حقیقت کو فراموش کر دینا فریب ہے اور یہی زمین کے طلسم کا خاصا ہے۔

ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں داخل ہونے میں کسی مرحلہ پر تعطل نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ chain (زنجیر) گھوم رہی ہے جس کی کڑیاں کبھی بچپن کا روپ دھار لیتی ہیں، کبھی جوانی کے خدوخال اختیار کر لیتی ہیں، کبھی بڑھاپے میں منتقل ہو جاتی ہیں اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ Chain ایک ہے، کڑیاں بھی ایک ہیں لیکن ہر آن، ہر لمحہ اور ہر کڑی ایک نئے رنگ اور روپ میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ

''ہر لمحہ اور ہر آن ازل ہے۔''

کُن کی آواز ریکارڈ ہے اور کائنات میں مسلسل گونج رہی ہے۔ آدمی کے زمین پر آنے کا مطلب یہ ہے کہ جو بچہ اس زمین پر پیدا ہوا، یہ اُس عمل کا مظاہرہ ہے جس عمل کے نتیجہ میں آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ نوع آدم کا فرد ہے۔ جب تک اس بچہ نے جنت میں نافرمانی نہیں کی، یہ بچہ زمین پر پیدا نہیں ہوا۔

پیراسائیکالوجی کے علم کے تحت نافرمانی سے فرماں برداری کے زون میں واپس جانے کا طریقہ فرماں برداری ہے۔ فرماں برداری کے فارمولے سے واقف ہونے کا راستہ اطلاع کے نظام سے واقف ہونا ہے۔

آدمی جان لے کہ وہ ایک ''فارمولا'' ہے اور یہ فارمولا ''اطلاع'' سے کھلتا ہے۔ فارمولے کے اندر وہ تخلیقی عناصر جنہوں نے فارمولے کو زندگی بخشی ہے، متحرک ہیں۔ اس تحریک کی بدولت آدمی اندر موجود ان فارمولوں کا علم سیکھ لیتا ہے جن فارمولوں سے اس کی اپنی تخلیق ہوئی۔ اپنی تخلیق سے واقف ہونے کے بعد وہ فارمولے فرد کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن سے مخلوقات تخلیق ہوئی ہیں — وہ فارمولے جن پر کائنات کی ساخت قائم ہے اور وہ فارمولے جن کے سبب عالمین میں نظام زندگی جاری ہے۔ (قسط: ۵)

جب آدمی کسی خواہش کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے تو درحقیقت وہ اس شے کے تشخص کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔ تشخص گہرا ہو جائے تو شے کے خواص فرد میں منتقل ہوتے ہیں اور فرد کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اس لئے مادی چیزوں کے بجائے اس ہستی کے قرب کی تمنا کریں جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے۔

سرخ، زرد یا بے رنگ ــــ؟

روشنی وہ نہیں ہے جس کو ہم روشنی سمجھتے ہیں۔ ہمیں رنگوں کو دیکھنے کی عادت ہے۔ ہم سفید رنگ کو دن اور سیاہ کو رات کہتے ہیں۔ دن سفید اور رات سیاہ نہیں ہے۔

عمل، ردعمل ــــ عمل کی تکرار زندگی ہے جب کہ زندگی اس وقت بھی موجود تھی جب عمل تھا نہ ردعمل، انسان موجود لیکن تذکرہ نہیں تھا۔

خالق کائنات کا ارشاد ہے،

''کیا انسان پر زمانہ میں ایک وقت ایسا نہیں گزرا جب اس میں تکرار نہیں تھی؟'' (الدھر:۱)

تکرار کا تعلق شعور سے ہے۔ تکرار سے پہلے کی حالت لاشعور ہے۔ لاشعور وہ مقام ہے جس کو فکشن نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فکشن نظر محدود کرکے دکھاتی ہے جس سے اصل نظر انداز ہوجاتی ہے۔

نوع آدم کی دو کیٹیگری ہیں۔

۱۔ انسان

۲۔ آدمی

جو شے مشاہدہ میں آجائے وہ شعور ہے۔ شعور انسان کا بھی ہے اور آدمی کا بھی۔ آدمی کا شعور فکشن کو دیکھتا ہے اور انسان کا شعور حقیقت دیکھتا ہے کیوں کہ وہ باطن سے واقف ہوجاتا ہے۔

آدمی کا شعور مفروضوں پر قائم ہے۔ فکشن شعور کی نشانی ہے کہ اس میں تغیر ہے۔ آدمی تغیر کی نظر سے دن رات چیزوں کو بدلتا ہوا دیکھتا ہے یہاں تک کہ خود بھی ہر روز بدل جاتا ہے۔

جنت میں نافرمانی سے قبل انسان حقیقی حواس سے واقف تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کرکے شجر ممنوعہ کے قریب جانے سے حواس کی فرضی (الوژن) تقسیم میں الجھ گیا اور آنکھوں پر تغیر کا غلبہ ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے نوع آدم کو تغیر اور غیر متغیر زندگی دونوں کا علم عطا کیا ہے اور صحیح اور غلط کی تمیز سکھائی ہے۔ دونوں رخ اس کے اندر موجود ہیں، وہ جب چاہے، حقیقت سے واقف ہوجائے اور جب چاہے گم راہی اختیار کرلے۔

عمل کی ابتدا حرکت سے ہوتی ہے۔ بادل اسفنج کی طرح ہیں۔ مخالف سمتوں سے دباؤ کے سبب بادلوں کے اندر ذخیرہ، پانی کی شکل میں برستا ہے، زمین پر

روئیدگی ظاہر ہوتی ہے اور تخلیقات نشوونما پاتی ہیں، جان دار روئیدگی سے استفادہ کرتے ہیں اور نسل کی افزائش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

زمین پر زندگی کا آغاز فضا میں بادلوں میں دباؤ پیدا ہونے سے ہوتا ہے۔ نتیجہ میں ایک کے بعد دوسرا نظام حرکت میں آتا ہے اور زندگی کا نظام جاری رہتا ہے۔ ایک حرکت سے کائنات کے تمام کروں میں تحریک پیدا ہوتی ہے کیوں کہ نظام مربوط ہے۔

ہوا کا جھونکا جہاں سے گزرتا ہے، ہر شے کو متحرک کر دیتا ہے۔ پانی برسنے کی طرح ہوا کے چلنے سے حرکت میں تکرار ہوئی۔ تکرار سے زندگی مظہر بنی۔

زندگی اور مظاہرہ میں فرق ہے۔ ہم ظاہر کو زندگی سمجھتے ہیں، زندگی مظاہرہ سے پہلے موجود ہے۔ مظہر بننے کا عمل متوجہ کرتا ہے کہ موجود شے کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ مظاہرہ کو زندگی سمجھا جاتا ہے جب کہ مظاہرہ عکس ہے، زندگی اس مقام پر ہے جہاں سے عکس آ رہا ہے۔ مظاہرہ سے پہلے زندگی غیب ہے۔

وہ تمام مخلوقات جو ناپید ہو چکی ہیں اور جن کا وجود بظاہر روئے زمین پر نہیں ہے، وہ اب بھی غیب میں موجود ہیں اسی لئے ہمیں ان کا خیال آتا ہے۔ فلموں میں ان کے کردار دکھائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ڈائنوسار (Dinosaur) ہے۔

''زمانۂ قدیم میں زمین پر ڈائنوسار تھے جو اب نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں لیکن آدمی جب چاہے انہیں تصور میں دیکھ سکتا ہے۔ وہ کہیں پر ہیں اس لئے ان کی تصویر کا نقش دماغ میں بن جاتا ہے۔ ڈائنوسار کا وجود یکسر ختم ہو جائے تو ذہن سے ان کا ریکارڈ حذف ہو جائے گا۔ ہم آگے بڑھ گئے ہیں اور ڈائنوسار ریل کے تختوں کی طرح پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کا پیچھے رہ جانا موت نہیں — ہماری نظروں سے اوجھل ہونا ہے۔''

(آج کی بات: نومبر 2016ء)

سوال یہ ہے کہ کُن فیکون کے وقت جو شے تخلیق ہوئی وہ کائنات کے قیام تک موجود رہے گی پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ مخلوقات ناپید ہو گئیں جب کہ وہ پردہ کے پیچھے موجود ہیں — ؟

مظاہرہ کیا ہے — ؟ کچھ نہیں تھا اور کچھ ہو گیا لیکن جو کچھ ہوا — اس نے کچھ نہ ہونے کا جامہ پہن لیا۔ ہونا، نہ ہونا اور دراصل ہونا ایک زاویۂ نظر بن گیا۔

۱۔ کچھ نہ ہونا — غیب ہے۔

۲۔ جو کچھ ہوا — ظاہر ہے۔

۳۔ ظاہر نے غیب (کچھ نہ ہونے) کا جامہ پہن لیا۔

شے غیب سے ظاہر ہوتی ہے اور غیب بن جاتی ہے۔ اگر ہم صرف ظاہر ہونے کو زندگی سمجھ لیں پھر غیب کیا ہے — ؟ غیب کی عمومی تعریف یہ ہے کہ وہ مقام جو موجود ہے لیکن نظروں سے اوجھل ہے۔ اگر غیب کی یہی تعریف ہے تو اس تناظر میں ظاہر کی حقیقت کو نہ جاننے والے فرد کے لئے کیا دنیا ظاہر ہو کر بھی غیب نہیں — ؟

ظاہر اور غیب کی بنیاد روشنی ہے۔ ہماری نظر جب کسی شے پر پڑتی ہے تو گویا روشنی پر پڑتی ہے کیوں کہ ہم روشنی کے علاوہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔ آسمان، زمین، بادل، فضا، کہکشانی نظام، چاند، سورج، پہاڑ، سمندر، میدان، حیوانات، نباتات، پرندے، حشرات، انسان اور حواس — سب روشنی ہیں۔ روشنی کو رنگ میں دیکھنا الوژن ہے۔ حقیقی نظر کہتی ہے کہ روشنی کو روشنی اور رنگ کو رنگ دیکھو۔ جب کہ ہمیں روشنی کے علاوہ ہر چیز نظر آتی ہے۔

جب آدمی روشنی سے واقف نہیں لیکن روشنی کی مدد سے دیکھتا ہے تو پھر کون ہے جس کے دیکھنے کو وہ اپنا دیکھنا سمجھتا ہے لیکن اس سے واقف نہیں ہے جو دیکھ رہا ہے —؟ دیکھنے کی اس طرز کو قرآن کریم میں مثال سے بیان کیا گیا ہے،

''ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب آگ نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔'' (البقرۃ: ۱۷)

روشنی وہ نہیں ہے جس کو ہم روشنی سمجھتے ہیں۔ ہمیں رنگوں کو دیکھنے کی عادت ہے۔ ہم سفید رنگ کو دن اور سیاہ کو رات کہتے ہیں۔ دن سفید اور رات سیاہ نہیں ہے۔ سیب کو سرخ یا زرد رنگ سے پہچانتے ہیں۔ یہ دونوں رنگ قائم نہیں رہتے، بدل جاتے ہیں پھر سیب سرخ یا زرد کیسے ہو گیا؟ آدمی جب نور بصارت سے لاعلم ہو تو وہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس کی مثال اندھے، گونگے اور بہرے کی ہے۔ وہ رنگ کو روشنی سمجھتا ہے اور روشنی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کا واقعہ یہاں بیان کیا جائے تو فکشن اور حقیقت کو سمجھنا آسان ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ ذرا ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے، تمہارے لئے انگارے لے آؤں یا اس آگ پر مجھے کوئی راہ نمائی مل جائے۔ وہاں پہنچے تو پکارا گیا، ''اے موسیٰؑ! میں ہوں تیرا رب! جوتے اتار دے۔ تو وادی مقدس طویٰ میں ہے۔'' (طٰہٰ: ۱۰۔۱۲)

آیت میں نگاہ کے تین زاویوں کا بیان ہے۔

۱۔ اس نے ایک آگ دیکھی۔

۲۔ مجھے کوئی راہ نمائی مل جائے۔

۳۔ اے موسیٰ! میں ہوں تیرا رب!

دیکھنے کے پہلے زاویہ کی اس آیت میں نفی کی گئی ہے کیوں کہ یہ زاویہ گمان پر قائم ہے۔ دوسرے مرحلہ میں ضمیر کی راہ نمائی کا بیان ہے جس پر عمل کر کے حضرت موسیٰؑ نے دیکھنے کی پہلی طرز کو نظر انداز کیا اور بالآخر قریب پہنچ کر حقیقت آشنا ہوئے۔

دیکھنے کی ابتدا آواز سے ہوتی ہے۔ آواز سن کر دماغ کی اسکرین پر تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ شعوری طرز یہ سمجھتی ہے کہ نمایاں ہونا شے کا ابھرنا یا سطح پر آنا ہے۔ ابھرنے سے اسپیس تخلیق ہوتی ہے اور اسپیس کی وجہ سے فرد خود کو شے یا دنیا سے الگ سمجھتا ہے۔

شعور جسے ''نمایاں ہونا'' کہتا ہے، لاشعور کے لئے وہ داخل ہونا ہے۔ نمایاں ہونے کا مطلب ہے کہ شے باہر ہے۔ داخل ہونے کے معنی ہیں کہ شے اندر ہے — ہم اس شے میں داخل ہوئے اور وہ شے ہمارے لئے نمایاں ہوگئی۔ جب کہ شعور نے اس دیکھنے کو باہر دیکھنے کا نام دیا۔

مقصد یہ بتانا ہے کہ چیزیں حقیقت میں کیا ہیں، یہ دیکھنے کے بجائے ہم انہیں اپنے انداز میں دیکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم پر نافرمانی کا پرت غالب ہے اور ہم چیزوں کو حقیقت کے برعکس دیکھتے ہیں۔

تفکر کرنے والوں کی باتیں ہمیں متاثر کرتی ہیں اور انہونی محسوس ہوتی ہیں کیوں کہ ان کی طرز نگاہ الگ ہے۔ مگر کیا حقیقت کو حقیقت دیکھنے والے ان لوگوں کا تعلق اس معاشرہ سے نہیں — ؟

ان میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ وہ بدلتی ہوئی چیزوں پر تکیہ نہیں کرتے، جاننا چاہتے ہیں کہ کیا کوئی شے ایسی ہے جو تبدیل نہیں ہوتی — ؟ یہ سوال ان کو حقیقت تک پہنچا دیتا ہے۔

خلاصہ: ہم تغیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ زندگی اللہ تعالیٰ کے علوم میں سے ایک علم ہے اور اللہ کی صفات میں تغیر نہیں ہے۔ زندگی کی صحیح تعریف جاننے کا سورس الہامی کتابیں اور آخری آسمانی کتاب قرآن کریم ہے۔ مالک الملک اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

''کیا انسان پر زمانہ میں ایک وقت ایسا نہیں گزرا جب اس میں تکرار نہیں تھی؟'' (الدھر:۱)

تکرار — مظاہرہ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی مظہر بننے سے پہلے موجود ہے۔

پیاس اور پانی

تشنگی محسوس ہوتی ہے تو علامات کا ظہور ہوتا ہے۔ حلق خشک ہو جاتا ہے، زبان سوکھنے لگتی ہے، ہونٹوں پر پپڑی جم جاتی ہے۔ یہ علامات بظاہر پیاس کی ہیں۔ سارے مظاہرات اشارہ کرتے ہیں کہ جسم کو سیرابی کی ضرورت ہے۔ تصور میں گلاس، پیالہ یا پانی کی تصویر کافی حد تک نمایاں ہوتی ہے۔ آدمی جب پانی پی لیتا ہے تو تشنگی دور ہو جاتی ہے لیکن تشنگی دور نہیں ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد پھر پیاس لگتی ہے اور پانی پینے کا خیال آتا ہے۔ پانی پینا کیا ہوا اور دوبارہ پیاس لگنا کیا ہے — ؟ قارئین! بتایئے کہ تکرار کیا ہے — ؟

ضابطۂ حیات

باادب بانصیب ✦ بےادب بےنصیب ✦

Arabic

صاحب الأدب ذا نصيب
فاقد الأدب بلا نصيب

Urdu

باادب بانصیب
بےادب بےنصیب

Chinese

礼让者兴
无礼者衰

English

Civility is boon
Incivility, misfortune

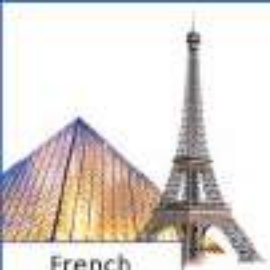

French

Celui qui respecte les autres est chanceux

Celui qui ne respecte pas les autres n'est pas chanceux

German

Durch ehrung der anderen erntet man segen

Ohne ehrung kein segen

Malay

Sastera, diberkati

Bia adab, nasib malang

Russian

Уважение ведёт к успеху

неуважение - к неудаче

Spanish

El hombre contés es afortunado

El descortés desafortunado

زاہدہ تبسم

درخت باتیں کرتے ہیں

نباتات کی دنیا باشعور اور فہم رکھتی ہے

★ سنڈی سے متاثر پودا خطرہ کی صورت میں مخصوص بو خارج کر کے آس پاس موجود پودوں کو مطلع کرتا ہے۔ دیگر پودے خبردار ہو جاتے ہیں اور دفاع میں بو خارج کر کے سنڈی کو قریب آنے سے روکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ مخصوص بو پرندوں اور بھڑوں کو پیغام دیتی ہے کہ ان کے شکار کا بندوبست ہو گیا ہے لہٰذا وہ سنڈی کھانے آ جائیں۔

★ ایک پتّے کو کھایا جا رہا ہو تو دوسرے پتّے میں اطلاع منتقل ہوتی ہے اور پودے میں کیلشیم کی سطح بڑھ جاتی ہے۔

★ پودا جب قحط کا سامنا کرتا ہے تو اپنے اندر جذب پانی کو دیکھ بھال کر استعمال کرتا ہے۔

★ چھوئی موئی پودے کو چھونے سے پتّے مڑتے ہیں۔ نقصان پہنچائے بغیر یہ عمل دہرایا جائے تو ہاتھ لگانے پر پتّے مڑنے کا عمل رک جاتا ہے۔ یعنی پودا ''یادداشت'' استعمال کر کے شناخت قائم کر لیتا ہے کہ یہ میرا دشمن نہیں ہے۔

★ پودے ''تسبیح'' کے قانون سے واقف ہیں۔

تقریباً دو سال قبل نباتات اور انسانی جسم کے حوالہ سے دل چسپ تحقیق کی گئی اور بتایا گیا کہ محققین نے پالک کے پتّوں کو انسانی دل کے ٹشوز میں تبدیل کرنے میں کام یابی حاصل کر لی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دل کے عضلات کے لئے پالک کے پتّے کی رگیں ساخت کی وجہ سے بہت مناسب ہیں۔

بائیو انجینئرنگ کے میدان میں عرصہ دراز سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ایسا ویسکیولر نظام (رگوں اور نالیوں سے متعلق) بنایا جائے جو نئے ٹشوز کو خون کی فراہمی یقینی بنائے۔ حالیہ بائیو انجینئرنگ جس میں 3-D ٹیکنالوجی شامل ہے، خون کی رگوں کا باریک ترین جال نہیں بنا سکی ہے جو ٹشوز کو آکسیجن، غذا اور ضروری مالیکیولز (سالمات) مہیا کرے۔ مذکورہ تجربہ ابھی انسانی دل پر نہیں کیا گیا اس لئے اس کی کام یابی سوالیہ نشان ہے۔ البتہ ماہرین کو امید ہے کہ دل کے مریضوں کے لئے یہ تحقیق کارآمد ہوگی۔

تخلیقی نظام پر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے ہر شے میں افادیت رکھی ہے۔ پتّا زندہ لیبارٹری ہے جس پر

انسانی اعضا کو کاشت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انسانی جسم کے ٹشوز کی مرمت کے لئے نباتات کی دنیا سے مدد لینا ایسا عمل ہے جو ماحولیاتی نظام میں نباتات کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

پالک کے پتّے پر تجربہ کی تفصیل پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں نکتہ رہ گیا۔ کیا پتّا درخت سے الگ ہوکر بھی زندہ وجود ہے؟ پتّے پر سے نباتاتی خلیات صاف کرکے انہیں انسانی خلیات میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے تو پتّے کا اپنا وجود کیا ہوا؟

سوال تکرار کرتے ہوئے تلاش میں بدل گیا۔ تلاش کا نتیجہ فی الحال سامنے نہیں آیا البتہ ذہن میں پتّے سے درخت اور درخت سے گھنے جنگل کا تصور بنا اور ذہن نباتاتی دنیا کے فوائد کی طرف متوجہ ہوگیا۔

چلتے ہو تو چمن کو چلئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادوباراں ہے

بہار کا ذکر ہو تو ذہن میں گھنے درختوں اور رنگین پھولوں کی تصویریں آتی ہیں۔ سبزہ فطرت کی اور سبز رنگ توازن کی علامت ہے۔ گرمی کی شدت کم کرکے فضا خوش گوار بنانے، ہوا میں تازگی پیدا کرنے اور آلودگی پر قابو پانے میں درختوں کا کردار اہم ہے۔

مشاہدہ ہے کہ ہریالی لطیف حِس کو جگاتی ہے نتیجہ میں تخلیقی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ گھر کے صحن، گیلری یا برآمدہ میں پھل دار پودے لگانے کا تجربہ کریں اور ان پودوں سے باتیں کریں۔ چہل قدمی یا پیدل چلتے ہوئے درختوں پر توجہ مرکوز کریں تو اجنبیت، انسیت میں اور انسیت، دوستی اور محبت میں تبدیل ہوجائے گی۔ پھر محسوس ہوگا کہ درخت ہمیں سنتے اور جواب دیتے ہیں، ہم بھی ان سے بات کرسکتے ہیں۔

زمین پر کھربوں درخت ہیں۔ درختوں میں شماریات سے زیادہ پتّے ہیں۔ درختوں کی تقریباً 60 ہزار انواع بتائی جاتی ہیں اور ہر نوع ایک خاندان ہے۔

درختوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ بات چیت نہیں کرتے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ ہماری طرح سماجی زندگی گزارتے ہیں، ان کے خاندان اور برادریاں ہوتی ہیں، رشتہ داریاں اور تعلقات نبھاتے اور حسب نسب پر فخر کرتے ہیں۔

ایک قسم کے درخت اکثر جوڑوں کی شکل میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ کسی ایک درخت کو کاٹ دیا جائے تو اس کے قریب موجود دوسرا درخت بھی متاثر ہوتا ہے۔ مختلف اقسام کے درخت بھی آپس میں جوڑے بناتے ہیں اور ایک دوسرے سے دوستی رکھتے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کی شاخیں مل جاتی ہیں۔

اگر کوئی درخت کم زور ہونے لگے تو پڑوسی درخت جڑوں کے ذریعے غذا فراہم کرتے ہیں۔ جڑوں کے درمیان فنجائی کے نیٹ ورک غذا کو کم زور درخت تک پہنچاتے ہیں۔ بعض اوقات چھوٹے قد کے درخت

بڑے درختوں کے لئے ایثار کرتے ہیں اور کم زور ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔

درختوں کی معاشرتی زندگی میں تعمیری سوچ غالب ہے۔ خطرہ قریب ہو تو پرانا ''مادر درخت'' اپنے خاندان کو جڑوں کے ذریعے سیال شوگر فراہم کر کے خبردار کر دیتا ہے۔ فنجائی کے ذریعہ اس ربط کو wood wide web کا نام دیا گیا ہے۔ جڑوں کے ذریعہ فنجائی کی بدولت درخت مسلسل رابطہ میں رہتے ہیں اور حملہ آور کا پتا چلتے ہی دفاعی کیمیکل خارج کرتے ہیں۔ wood wide web کے ذریعے سے پورا جنگل ایک دوسرے سے منسلک ہوتا ہے۔

درختوں کی نسلوں میں انتقال اقتدار کا بھی عمل ہوتا ہے۔ یہ عمل سالہا سال جاری رہتا ہے اس طرح نئی نسل خود کو موسم اور ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

درخت کی کہانی بیج یا قلم سے شروع ہوتی ہے۔ بیج تغیر سے گزرتا ہے تو جڑ، تنا، پھول اور پھل نظر آتے ہیں۔ کھربوں درختوں میں سے صرف ایک پتّے پر غور کیا جائے تو اس کا پوری کائنات سے ربط محسوس ہوتا ہے۔ وضاحت یہ ہے کہ ہر پتّا ہوا، پانی، سورج کی روشنی، چاندنی، زمین میں ذخیرہ مقداروں سے مستفیض ہوتا ہے اور ان کے تعاون سے صحت مند ہے۔

خوردبین سے دیکھا جائے تو پتّے میں رگوں کا جال اور سینکڑوں کی تعداد میں سوراخ ہیں۔ مختلف رنگ ہیں، نقوش اور خدوخال ہیں، رگوں میں پانی خون کی طرح حرکت میں ہے۔

پتّا ــــ جان دار ہے۔ مسامات کے ذریعے سانس لیتا ہے۔ سورج کی روشنی مسامات میں داخل ہوتی ہے تو غذا کی تیاری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ غذا آدمی اور حیوانات کے کام آتی ہے۔ پتّے سوکھ کر زمین پر گرتے ہیں تو درختوں کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں ورنہ آدمی کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں ہے کہ وہ نباتات کی نشوونما کے لئے اتنی بڑی زمین پر کھاد ڈال سکے۔ درخت کے پتّے کھاد بن جاتے ہیں اور یہی کھاد تغیر سے گزر کر پتّا بن جاتی ہے۔

ہر مخلوق کی طرح درختوں کے درمیان بھی اطلاع کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ان کی اپنی زبان ہے جو آدمی کی سماعت سے ماورا ہے۔ کہا جائے کہ پودے کیمیائی زبان بولتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ یہ ہوا میں موجود کیمیائی سگنلوں کو شناخت کر لیتے ہیں۔ ان اشاروں (signals) کو ائیر میل کا نام دیا گیا ہے۔

پودے ہوا میں خوش بو گھول کر دوسرے بڑے پودوں سے اطلاعات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ پڑوسی پودے اس خفیہ پیغام کو سمجھ کر دفاعی اقدام کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر سنڈی سے متاثر پودا ایسی بو خارج کرتا ہے جس میں مخفی پیغام آس پاس موجود پودے سمجھ لیتے ہیں اور دفاع میں اس قسم کی بو خارج کرتے ہیں

کہ سنڈی قریب نہ آئے۔اس طرح پودے اس بو کے ذریعے پرندوں اور بھڑوں کو پیغام دیتے ہیں کہ سنڈی یہاں موجود ہے اور ان کے شکار کا بندوبست ہوگیا ہے لہٰذا وہ سنڈی کھانے کے لئے وہاں آجائیں۔نتیجہ میں بھڑ ایسے پودوں کے قریب آتے ہیں اور ان پر انڈے دے جاتے ہیں۔انڈوں سے لاروے نکلنے کے بعد لاروے ان سنڈیوں کو کھا جاتے ہیں۔

درخت گفتگو کے لئے الٹراسانک آوازوں سے بھی مدد لیتے ہیں۔قحط سالی کے دوران درختوں سے نکلنے والی ان آوازوں کو ریکارڈ کیا گیا ہے جو آدمی کی سماعت سے سوگنا تیز رفتار ہوتی ہیں اس لئے آدمی کے لئے ان کو سننا ممکن نہیں۔

ایک تجربہ میں مرتے ہوئے درخت کی لکڑی کا hydrogel میں معائنہ کیا گیا۔معلوم ہوا کہ لکڑی عجیب سی آوازیں نکال رہی ہے۔اس عمل کے دوران بلبلوں جیسی آوازیں پیدا ہوتیں اور غائب ہوجاتیں۔تجربہ کرنے والوں نے آواز سمجھنے کی کوشش کی تو محسوس کیا کہ لکڑی پانی مانگ رہی ہے۔

درخت زیر زمین جڑوں کے ذریعے پانی حاصل کرتے ہیں کیوں کہ وہ ہوا میں بننے والے بلبلوں کے ذریعے زیر زمین نمی کو اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔قحط سالی میں شاہ بلوط کے درخت کو روتا ہوا دیکھا گیا اور اس سے قطرہ قطرہ گرنے والے پانی کو اس کے آنسو قرار دیا گیا۔

محقق برقیاتی سگنلوں میں اتار چڑھاؤ کے ذریعے درختوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔درختوں کی دنیا میں بات چیت کے تین ذرائع سامنے آئے ہیں:

۱۔ کیمیکل کے اخراج کا تبادلہ

۲۔ الیکٹریکل سگنل

۳۔ الٹراسانک لہریں

سراغ رساں آلات اور سینسروں کے ذریعے ان سگنلوں میں مخفی پیغام سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ مخصوص آلات کے ذریعے درخت کی آواز کو سنا جائے تو ابتدا میں طوفان کی طرح یا بارش کی آواز محسوس ہوگی لیکن سنتے رہیں تو معلوم ہوگا کہ درخت آپ کو مختلف پیغامات دے رہے ہیں۔جیسے کہ میں پیاسا ہوں، مجھے سردی لگ رہی ہے، تم مجھے تکلیف دے رہے ہو وغیرہ۔اسی طرح جب سراغ رسانی کے آلات کے ذریعے پودوں کی آوازوں کو گانے کی صورت میں ریکارڈ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر درخت کا گیت الگ ہے۔

نباتات اور حشرات کا بھی آپس میں گہرا رابطہ ہے۔یہ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔مثلاً حیوانات میں سے بعض درختوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو کھالیتے ہیں اور بعض زمین کو زرخیز بناتے ہیں۔بدلہ

میں درخت انہیں غذا، پھولوں کا رس اور پناہ گاہ فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح شہد کی مکھی درست فریکوئنسی پر پھولوں سے زیردانے نکال لیتی ہے۔ یہ عمل بات چیت کے بغیر نہیں ہوتا۔

ہماری طرح درخت خوش ہوتے ہیں، روتے ہیں دباؤ اور تناؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ گرمی سردی کی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں اور خطرہ محسوس کر لیتے ہیں۔ ان تمام حالتوں میں مختلف اقسام کے اشارے تخلیق کرتے ہیں۔

علم نباتات میں یہ بات عرصہ دراز سے مستند ہے کہ درخت پوزیشن اور اسپیس کو محسوس کر لیتے ہیں۔ ان کی جڑیں زمین کی طرف اور تنا روشنی کی طرف حرکت کرتا ہے۔ رکاوٹ محسوس کرنے پر جڑ اور تنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ درخت کششِ ثقل کی وجہ سے زمین میں پیوست ہیں اس لئے کششِ ثقل کو محسوس کرتے ہیں۔ برقیاتی اور کیمیائی میدان میں فرق کر لیتے ہیں۔ تجربات کئے گئے ہیں کہ بڑھتی ہوئی جڑوں کو مطلوبہ سمت دی جاسکتی ہے اور اس کے لئے روشنی اور آواز سے مدد لی جاتی ہے۔

درخت کے ایک پتّے کو کھایا جا رہا ہو تو دوسرے پتّے میں اطلاع منتقل ہوتی ہے اور پودے میں کیلشیم کی سطح بڑھ جاتی ہے۔ ماہرین حیاتیات تسلیم کرتے ہیں کہ پودے کے ایک حصہ میں تبدیلی کو دوسرے حصہ میں ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔

چھوئی موئی (Mimosa) کو چھوا جائے تو پتّے مڑ جاتے ہیں۔ تجربہ کیا گیا ہے کہ اگر چھوئی موئی کو نقصان پہنچائے بغیر یہ عمل دہرایا جائے تو ہاتھ لگانے پر پتّے مڑنے کا عمل رک جاتا ہے۔ یعنی پودا ''یادداشت'' استعمال کر کے شناخت قائم کر لیتا ہے کہ اس نے مجھے پہلی بار نقصان نہیں پہنچایا۔ کہا جاتا ہے کہ چھوئی موئی کا پودا چالیس دن تک اس حرکت کو یاد رکھتا ہے۔

پودوں کے خلیوں میں کیمیائی سگنلوں کے نیٹ ورک ہیں جو آدمی اور حیوان کے دماغ کی طرح کام کرتے ہیں۔ اس نیٹ ورک کے ذریعے پودے ماضی کے تجربہ سے سیکھ کر رویہ میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں، فیصلہ کرتے ہیں اور تجربات یاد رکھتے ہیں۔

درخت وسائل کو پہچانتے ہیں، پانی، ہوا اور روشنی کا استعمال جانتے ہیں۔ موسموں میں تغیر جیسے خزاں اور بہار اور وقت کے گزرنے کو محسوس کرتے ہیں۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے درخت سوتے بھی ہیں۔

پودے مختلف رنگوں پر ردِعمل ظاہر کرتے ہیں اور روشنی کی خصوصیات کو یاد رکھتے ہیں۔ نیلی روشنی پتّوں کے لئے اور سرخ و نیلی روشنی پھولوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ سبز رنگ کلوروفل کی وجہ سے پودوں میں جذب نہیں ہوتا۔

پودا جب قحط کا سامنا کرتا ہے تو اپنے اندر جذب پانی کو دیکھ بھال کر استعمال کرتا ہے۔ پودوں میں فیصلہ

سازی کا عمل اس طرح دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کی کچھ انواع کو جب حیوانات سے خطرہ ہو تو یہ انفیکشن زدہ حصہ تباہ کردیتے ہیں۔

جنگلی پودا Dodder ایک وقت میں کئی پودوں پر گزارا کرتا ہے۔ میزبان پودے کے جینز چُرا لیتا ہے۔ یہ جین dodder کے جینوم کا حصہ بن کر کام کرتے ہیں۔ اس چوری کا مقصد یہ ہے کہ بہتر انداز میں میزبان کے غذائی مادوں کو حاصل کرسکیں۔

مخلوق میں ایک اہم تقاضا بات چیت ہے جس کا ذریعہ آواز ہے۔ آواز ایسی توانائی ہے جو شے میں وائبریشن (ارتعاش) کی وجہ سے ہمیں سنائی دیتی ہے۔ سننے اور بولنے کے دوران جسمانی سطح پر الیکٹریکل اور کیمیکل تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کے دوران بھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلیاں دراصل آواز کی لہروں کا مظہر ہیں جو ذہن کی اسکرین پر بکھرتی ہیں تو ہم دیکھتے، سمجھتے، محسوس کرتے اور بولتے ہیں۔

ہمارے اردگرد بے شمار آوازیں ہیں جن سے ربط کا ذریعہ لہریں ہیں۔ ہر شے کی لہر دوسری شے سے منفرد ہے۔ جن لہروں کو ہم قبول کرلیتے ہیں انہیں خیال کا نام دیتے ہیں۔ ٹیلی پیتھی کے ماہرین کہتے ہیں کہ خیال دراصل برقی رو ہے۔ برقی رو ایک جانب مرکوز ہو جائے تو دور دراز تک اثرات مرتب کرتی ہے نہ صرف انسان بلکہ ایسی چیزوں کو بھی متاثر کرتی ہے جو غیر ذی روح سمجھی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر شے تسبیح کرتی ہے، گفتگو کرتی ہے اور ربط میں ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کررہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کررہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگزر کرنے والا ہے۔''

(بنی اسرآءیل:۴۴)

تسبیح کا root word سبح ہے۔ سبح کے معانی ہوا یا پانی میں تیزی سے گزرنا، چلنا، دوڑنا، گھومنا، بولنا، تیرنا ہے۔ اس لفظ کا مجموعی مفہوم رابطہ، کمیونیکیشن اور حرکت ہے۔

وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ درختوں کے الیکٹریکل اور کیمیکل پیغامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری طرح ان کا مادی وجود بھی لباس ہے۔ سگنلوں کی ترسیل اور وصول کرنے والا ان کا ظاہری لباس نہیں بلکہ روحانی وجود ہے جو مخفی لہروں کے ذریعہ قریب اور دور موجود اپنی اور دیگر نوعوں سے گفتگو کرتا ہے۔

درخت کی اصل لہریں ہیں اس لئے درخت کی لہریں خالق کائنات کی تسبیح کرتی ہیں، مخلوق کی خدمت کرتی ہیں، ماحول میں موجود نظام سے محبت کرتی ہیں اور خلق خدا کے لئے دعائیں بھی کرتی ہیں۔

بلال حسن زئی

نو کروڑ میل دور ۔۔۔؟

سوچئے اور لکھئے

۱۔ جس مقام سے ہم ناواقف ہیں، اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ کا تعین ممکن نہیں۔

۲۔ نگاہ اسپیس کے دیکھنے کو دیکھتی ہے۔ لاکھوں میل دیکھنے کی صلاحیت، لاکھوں میل دیکھنے کی سکت ہے۔

۳۔ آدمی چاند ستارے نہیں، ان کا عکس دیکھتا ہے۔ اسی طرح آدمی خود کو نہیں، اپنے عکس کو دیکھتا ہے۔

۴۔ ایک شے ہر شے میں ہے۔

۵۔ اللہ سائے کو پھیلاتا اور سمیٹ لیتا ہے۔

۶۔ روشنی دیکھنے والے کو سب رنگوں میں نظر نہیں آتا۔

۷۔ رنگ بدلنے والی شے کا اپنا رنگ کون سا ہے؟

۸۔ مٹی ذرّہ ذرّہ جڑ کر پہاڑ اور پہاڑ ریزہ ریزہ بکھر کر مٹی ہو جاتا ہے۔ مٹی رنگوں کی بوقلمونی ہے۔

۹۔ رنگ ایک اسپیس پر دوسری اسپیس غالب ہونا ہے۔

۱۰۔ شے کا پھیلنا اور سمٹنا شے نہیں۔ شے اور ہے۔

۱۱۔ چاند ماں کو قریب اور محقق کو دور نظر آتا ہے۔

۱۲۔ نگاہ میں تغیر کے سبب شے سے منتقل ہونے والی توانائی ذخیرہ نہیں ہوتی۔

۱۳۔ ایمان بالغیب دراصل مشاہدہ ہے۔

آنکھ کی سکت چند میل تک دیکھنا یا پھر نہ دیکھنا ہے۔ ہمیں دور موجود پہاڑ نظر آتے ہیں لیکن لینس کے آگے بال آجائے تو باریک بال پردہ بن جاتا ہے۔ دیکھنے کی سکت کہاں گئی ۔۔۔؟ دوسری طرف یہی آنکھ سورج، چاند اور ستاروں کو بلا تعطل لاکھوں کروڑوں میل دور بآسانی دیکھتی ہے۔ اجرام فلکی کتنی دور یا قریب ہیں، اعداد و شمار قیاس پر قائم ہیں کیوں کہ اس طوالت کی پیمائش کے لئے آلات نہیں ہیں۔

۱۔ شے کو ناپنے کے لئے فرد کی دونوں کناروں تک رسائی نہ ہو تو کیا حاصل کئے گئے نتائج قابل اعتبار ہیں؟

۲۔ پیمائش کے دوران، درمیان میں کسی شے سے ٹکرانے کی وجہ سے انعکاس یا انعطاف پیدا ہو جس کی وجہ سے روشنی واپس آئے یا مڑ جائے، پھر خلا میں مطلوبہ مقام تک پیمائش کی درستی کا اندازہ کیسے ہوگا؟

۳۔ کوئی محقق چاند پر گیا نہیں، سورج کی اس کو خبر نہیں اور ستاروں کے چمکنے کے باوجود ستارہ تو دور کی بات، وہ اس کی چمک کے قریب بھی نہیں پہنچا۔ پھر کیسے معلوم ہوا کہ یہ سب اتنے دور یا قریب ہیں؟

۵۔ مان لیا جائے کہ چاند ڈھائی لاکھ میل اور سورج

نوکروڑمیل دور ہے اور ہم انہیں دیکھ رہے ہیں۔یعنی ہمارے اندر لاکھوں کروڑوں میل کی اسپیس کو احاطہ کرنے کی وسعت ہے۔سوال یہ ہے کہ نگاہ کے سامنے عمارت آجائے تو عمارت کے پیچھے موجود سورج چاند نظر کیوں نہیں آتے؟ جب کہ نظر آتے ہیں۔

۶۔چودھویں کی رات بصد شوق چھت پر ماہ کامل دیکھنے جاتا ہوں۔ابتدا میں آسمان پر سحر کا سماں ہوتا ہے لیکن چھت کے اوپر ایک اور چھوٹی چھت کی وجہ سے چاند نظر نہیں آتا۔اور میں گھوم پھر کر آگے پیچھے یا گلی میں نکل کر چاند دیکھتا ہوں۔ذہن سوال کرتا ہے کہ ڈھائی لاکھ میل دور دیکھنے والے فرد کے لئے مٹی کے ذرّات رکاوٹ کیوں بن گئے؟

۷۔اسپیس کی وسعت کے ساتھ اسپیس کو دیکھنے کی توانائی بھی حاصل ہوتی ہے تب نگاہ اس اسپیس کا احاطہ کرتی ہے۔ڈھائی لاکھ میل دور دیکھنے کی صلاحیت کے معنی ڈھائی لاکھ میل کی سکت ہے جس پر سوار ہوکر نگاہ آگے بڑھتی ہے۔

ڈھائی لاکھ میل دیکھنے کی سکت کسی بھی شے کو ریزہ ریزہ کرنے اور زمین کے ثقل کو توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔جب چاند اور ہمارے درمیان عمارت رکاوٹ بن جائے تو لاکھوں میل دیکھنے کی طاقت عمارت کو ریزہ ریزہ کرکے اپنا راستہ کیوں نہیں بناتی؟ وہ رک کیوں جاتی ہے؟

ہم نہیں جانتے کہ شے کیا ہے،ہم پردہ یعنی رکاوٹ سے واقف ہیں اور نظر جہاں رکتی ہے اسے منزل کا نام دے دیتے ہیں۔خانوادہ سلسلہ عظیمیہ فرماتے ہیں،

''چاند فلکیاتی مخلوق ہے اور فلک زمین سے الگ اسپیس ہے۔فلک پر تخلیق زمینی اسپیس سے آزاد مگر ایک حد تک پابند ہے ورنہ مخلوقات کو زمین سے چاند ستاروں کا 'عکس' نظر نہیں آئے گا۔''

چند سطروں کے بعد ایک شے کی ہر جگہ موجودگی کے قانون کو سمجھاتے ہوئے عظیمی صاحب لکھتے ہیں،

''فرض کیجئے — سیب اور کیلے میں مٹھاس کی مقدار بالترتیب 10 اور 15 فی صد ہو تو غور طلب ہے کہ چاند کی کرنیں دونوں میں موجود ہیں۔کیا ہم نہیں کہہ سکتے کہ چاند کی صفات معلوم کرنے کے لئے چاند پر جانا ضروری نہیں — چاند خود مختلف شکل میں پھلوں میں، سمندر کے مدوجزر میں، آدمی اور دوسری مخلوقات کی طبیعت اور مزاج میں داخل ہے۔''

(آج کی بات۔ستمبر 2019ء)

میری ناقص عقل نے اس تحریر سے جو مفہوم اخذ کیا وہ یہ ہے — ہم فلکی اجرام کے بجائے ان کا عکس دیکھ رہے ہیں۔چاند اور سورج کہیں اور موجود ہیں اور ان کی روشنی کا سورس بھی کوئی اور ہے۔بقول شاعر،

بجا چاند روشن ہے سورج سے لیکن
یہ سورج چمکتا ہے کس روشنی سے

سورج چاند سے منعکس ہوکر آنے والی روشنی خلا میں

پھیلی ہوئی ہے۔ ہماری نظر ان کو دیکھنے کے لئے خلا میں جس مقام پر رکتی ہے وہاں ہمیں عکس نظر آتا ہے۔

چاند سورج کی طرح ہم بھی عکس ہیں، ہماری اصل کہیں اور ہے۔ ہر مخلوق بشمول چاند، سورج، ستارے اور آدمی سب آئینہ ہیں۔ روشنی کہیں سے آکر ان آئینوں سے ٹکراتی ہے تو فضا میں عکس لہروں میں بکھرتا ہے۔ یہ عکس جن اسکرینوں پر پھیلتا ہے وہاں تصویریں بن جاتی ہیں۔ عکس اور سایہ ایک ہے۔ اللہ فرماتے ہیں،

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا پھر ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔''

(الفرقان: ۴۵۔۴۶)

زمین پر ہر شے کا ظاہر رنگوں سے مزین ہے اور رنگ پردہ ہیں کیوں کہ یہ محدود نظر کو آگے جانے سے روکتے ہیں۔ فرد سکت کے مطابق چیزوں کو دیکھتا ہے۔ شے میں رنگ بھی موجود ہے اور روشنی بھی۔ جس فرد میں روشنی دیکھنے کی صلاحیت بیدار نہیں ہوئی، وہ سیب کو لال، پیلے اور ہرے رنگ میں دیکھتا ہے اور جس نے روشنی دیکھ لی ہے، اسے سیب رنگوں میں نظر نہیں آتا، وہ سیب کے لئے مخصوص روشنی سے سیب کو پہچانتا ہے۔

فارمولا مشکل نہیں ہے۔ سیب لیں اور چند روز رکھیں، رنگ بدل جائے گا۔ مزید رکھیں، رنگ پھر بدلے گا۔ سوال یہ ہے کہ دن گزرنے کے ساتھ سیب کا رنگ بدل جاتا ہے، پھر سیب کا اپنا رنگ کون سا ہے؟

اسپیس اور رنگ کا کیا تعلق ہے.....؟

قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں باطنی علوم کے ماہرین اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔ لہٰذا اس قانون کو سمجھنے کے لئے ہم ایک بار پھر عظیمی صاحب کی تحریر سے استفادہ کریں گے جس میں انہوں نے اسپیس اور رنگ کی تشریح بیان کی ہے۔

''میٹریل (مادہ) سے جو وجود ظاہر ہوتا ہے اس کی بنیاد ٹوٹ پھوٹ ہے۔ کبھی مٹی ذرّہ ذرّہ جڑ کر پہاڑ بن جاتی ہے اور کبھی پہاڑ ریزہ ریزہ بکھر کر مٹی بن جاتا ہے۔ مٹی میں مسلسل تغیر ایسی صلاحیت ہے کہ ہر تغیر کی الگ الگ پہچان ہے۔ پھول کو دیکھ کر ذہن متوجہ ہوتا ہے کہ مٹی کے ذرّات میں جو رنگ ہیں وہ مقداروں اور ترتیب کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو رنگ آمیزی کی تخلیق شروع ہو جاتی ہے۔ پھول میں کئی رنگ ہو سکتے ہیں اور پھول ایک رنگ کا بھی ہوتا ہے جس کو ہم سفید کہتے ہیں۔

اس کو اس طرح سمجھنا آسان ہے کہ رنگ دراصل دوری ہے۔ سفید پر نیلا رنگ ڈال دیں تو سفید سے دوری واقع ہو جائے گی۔ دوری سے مراد یہ ہے کہ سفید اور نیلے کے درمیان دوری اس لئے ہے کہ ایک اسپیس کے اوپر دوسری اسپیس کا غلبہ ہو گیا۔ لیکن قانون کے تحت دونوں رنگوں کے درمیان فاصلہ

برقرار رہتا ہے۔ سورہ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے۔ دو دریا برابر چل رہے ہیں۔ دونوں کے رنگ الگ الگ ہیں۔ دونوں رنگوں کے پانی میں جوش پیدا ہوتا ہے تو پانی اوپر کی طرف اچھلتا ہے۔ اچھلنے کی صورت میں مشاہدہ یہ ہے کہ لہر ٹوٹ کر جب بکھرتی ہے تو کالے رنگ کا پانی کالے رنگ اور نیلے رنگ کا پانی نیلے رنگ میں گرتا ہے۔ یعنی دو رنگوں کے درمیان اسپیس تقسیم ہے۔ کالے اور نیلے پانی میں فاصلہ برقرار رہنے کی وجہ پانی کی مقداروں میں تغیر ہے اور تغیر رنگ ہے۔ تصوف میں رنگ سے مراد دوری ہے یعنی دو رنگ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں لیکن دونوں کی شناخت اپنی اپنی جگہ قائم ہے۔''

قارئین تفکر سے کام لیں کہ زمین جو مادی تخلیقات کی اصل ہے کیا وہ رنگین ہے؟ اگر وہ رنگین ہے تو پھر پھول میں رنگ آمیزی کیا ہے؟

یہاں ایک شے قریب ہے اور وہی شے دور ہے۔ ذہن نے چیزوں کے پھیلنے اور سمٹنے کے ''مظاہرہ'' کو شے سمجھ لیا ہے۔ وہ شے کے پھیلنے اور سمٹنے کے عمل پر غور نہیں کرتا۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ کون سی چیز پھیل رہی ہے اور کون سی چیز سمٹ رہی ہے۔

بچہ کی اسپیس پھیل کر لڑکپن میں داخل ہوتی ہے پھر بچہ کہاں گیا؟ بچہ بننا اسپیس کے پھیلنے کا عمل ہے اور یہ عمل تغیر پر قائم ہے۔ بچہ کی اسپیس سمٹتی ہے اور اسی اسپیس میں چھپی ہوئی لڑکپن کی اسپیس ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح بڑھاپا آجاتا ہے اور اسپیس نظر سے اوجھل ہوجاتی ہے۔

یہ بات طے ہے کہ شے اسپیس میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسپیس کے معنی شناخت کے ہیں۔ اسپیس نہ ہو تو چیزیں نظر نہیں آتیں۔ نگاہ کو دیکھنے اور کان کو سننے کے لئے اسپیس چاہئے۔ جذبات بھی اسپیس کی حد میں محسوس ہوتے ہیں۔ جن جذبات میں شدت زیادہ ہوتی ہے، فرد ابتدا میں ''شدت'' کی اسپیس سے ناواقفیت کی وجہ سے اس جذبہ کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن تجربہ سے گزرنے کے بعد بیان کردیتا ہے۔

ہم چاند، سورج اور ستاروں کو رنگوں کے ذریعے پہنچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ رنگ بدلتے رہتے ہیں اس لئے اجرام فلکی ہم سے کتنے قریب یا دور ہیں، ہمیں نہیں معلوم!

★ اماں نے بچہ کو دور موجود چاند قریب دکھایا۔

★ محقق کو سورج چاند تک جانے کا راستہ نہیں ملا تو اس نے انہیں لاکھوں کروڑوں میل دور بتادیا۔

بتایئے، ماں باپ کا تجزیہ درست ہے یا محقق کا؟

ان میں صحیح کون دیکھ رہا ہے یا دونوں کیا دیکھ رہے ہیں؟ تفکر کے دوران یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اگر دیکھنے میں قیاس شامل ہو تو دیکھنا — دیکھنا نہیں ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ جتنا ہم کسی شے کا فہم حاصل

کرتے ہیں، اسے قریب سمجھتے ہیں اور جب سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تو وہ دور نظر آتی ہے۔

اماں کو ان کی اماں نے بتایا کہ وہ دیکھو چاند! اس جملہ نے ان کے لئے آسمان پر موجود چاند کو قریب کر دیا۔ وہ چاند کو قریب سمجھ کر دیکھتی ہیں، ان کے ذہن میں شک نہیں ہوتا اس لئے انہیں چاند قریب محسوس ہوتا ہے۔

محقق نے بھی چاند کو ویسے ہی دیکھا ہے جیسے ہم دیکھتے ہیں لیکن جب اس نے پیمائش شروع کی تو اس کا سراغ نہیں ملا اس لئے کہ جسمانی نظام کے ساتھ اجرام فلکی تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ محققین کی کوشش مادیت تک محدود ہے یہی وجہ ہے کہ اجرام فلکی انہیں لاکھوں کروڑوں میل دور نظر آتے ہیں۔

مضمون میں دیئے گئے اقتباسات پر غور کیا جائے تو راستہ مل جاتا ہے کہ چاند اور سورج ہم سے دور نہیں ہیں، ان کی کرنیں اور شعاعیں ہر شے میں موجود ہیں۔ لہٰذا اوپر تلاش کرنے کے بجائے زمین پر تخلیقات کی ایکویشن پر غیر جانب داری سے تفکر کیا جائے تو رسائی ہو جائے گی کیوں کہ اندر میں تفصیلات موجود ہیں۔

ہم جب کسی شے کی اسپیس کا احاطہ کرتے ہیں تو اس اسپیس کے اندر موجود توانائی منتقل ہوتی ہے اور ہم توانائی کی مدد سے اس شے کو دیکھتے ہیں۔ ہماری توجہ اسپیس کے ظاہر کی طرف ہے اور ظاہر مسلسل تبدیل ہو رہا ہے اس لئے منتقل ہونے والی توانائی تغیر کی وجہ سے ذخیرہ ہونے کے بجائے واپس چلی جاتی ہے اور شے کی حقیقت کو دیکھنے کی سکت ہمارے اندر بیدار نہیں ہوتی۔ سوچنا یہ ہے کہ بالآخر دیکھنے کا قابل اعتبار طریقہ کیا ہے—؟

۱۔ پہلے اس بات کا یقین ہو کہ ہم شے کی پہچان کو رنگوں سے منسوب کرتے ہیں جب کہ رنگوں میں تغیر ہے۔ جو شے اپنی حالت پر قائم نہیں ہے، اس کی بنیاد پر حقیقت کا تعین کیسے کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ شے کو شے کی نظر سے دیکھیں۔ جب تک آدمی کسی کے دل میں داخل نہ ہو، اس کے دل کا حال نہیں جان سکتا۔ پھر چاند، سورج، ستاروں یہاں تک کہ سیب کے اندر داخل ہوئے بغیر ان سب کے بارے میں رائے کیسے قائم کی جا سکتی ہے؟

۳۔ ذہن سے تغیر کو دور کریں۔ جب تک ذہن شک اور یقین میں رد و بدل ہوتا رہے گا، ہر شے بدلتی ہوئی نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ،

''اس کتاب میں شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔'' (البقرۃ: ۲۔۳)

غیب پر ایمان، غیب کا مشاہدہ ہے کیوں کہ مشاہدہ کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ شک سے دور ہو کر ایمان میں داخل ہونے کا طریقہ ہر حال اور قال میں اللہ کی طرف متوجہ رہنا ہے۔

بادشاہ کون ــــ؟

''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔'' (العلق: ۱۔۵)

کسی ملک پر درویش صفت بادشاہ کی حکومت تھی۔ وہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ اللہ نے مجھے اس ملک کی باگ ڈور سونپ دی اور ہزاروں لوگوں پر حاکم بنایا لیکن اس ملک میں دوسری مخلوقات بھی رہتی ہیں جن پر ہمارے بنائے ہوئے قواعد نہیں چلتے۔ میں بحیثیت آدم خود کو جانوروں سے بہتر سمجھتا ہوں جب کہ یہ مجھے خاطر میں نہیں لاتے۔ یقیناً زمین پر بادشاہت کے لئے جو خصوصیات درکار ہیں، وہ مجھ میں نہیں۔

بادشاہ نے سوچا کہ تفکر کرنے کے لئے اس موضوع پر دربار میں حکما اور دانش وروں کو بلانا چاہئے۔ مقررہ روز سب موجود تھے۔ بادشاہ تخت پر براجمان ہوا اور پوچھا، جس مسئلہ پر میں بات کرنا چاہتا ہوں اس نے مجھے بہت عرصہ سے پریشان کیا ہوا ہے۔

ایک حکیم بولا، بادشاہ سلامت! حکم کیجئے امید ہے کوئی حل نکل آئے گا۔

میں اس ملک کا بادشاہ ہوں لیکن اکثر غور کرتا ہوں کہ کیا میں واقعی بادشاہت کے لائق ہوں؟ نظام کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اور میں حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ اپنے منصب سے انصاف کروں۔ لیکن میں بہت سے معاملات میں بے بس ہوں۔ زندگی موت پر مجھے اختیار نہیں، نہ اپنی مرضی سے سانس لیتا ہوں۔ کسی کے دل کا حال میں نہیں جانتا۔ میری مملکت میں پرندے ہواؤں میں اڑتے ہیں، مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں لیکن میں تو زمین پر چلنے کے لئے بھی کہیں سے ملنے والی حرکت کا محتاج ہوں۔

دربار میں معززین سمجھ گئے کہ معاملہ گمبھیر ہے۔

بادشاہ نے پوچھا، بتایئے ملک کے حکم ران میں کیا صفات ہونی چاہئیں ــــ؟

سب کی سانس میں سانس آئی کہ یہ کون سا مشکل سوال ہے۔ منٹوں میں حل ہو جائے گا۔ اس سے پہلے کہ حکیموں میں سے کوئی جواب دیتا، وزیر خاص نے سینہ فخر سے پھلاتے ہوئے کہا، جناب عالی! ملک کا

حکم ران اپنوں کے لئے پانی، غیروں کے لئے آگ، زمین کی طرح فیاض، آسمان کی طرح بے نیاز، گھوڑے سے زیادہ تیز رفتار، عقاب سے زیادہ تیز نگاہ، سیاروں سے زیادہ راست رو، کوّے سے زیادہ محتاط اور شیر سے زیادہ بہادر ہو۔ آپ انصاف پسند بادشاہ ہیں اور ان امور کا خیال رکھتے ہیں۔

بادشاہ بولا، زمین، آسمان، سیارے، پانی اور آگ، اگرچہ سب مخلوق ہیں لیکن اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے نوع آدم ان سے مرتبہ میں بڑی ہے۔ تم نے حکم ران کو ان سے تشبیہ دی۔ اس کی وجہ اس لئے سمجھ میں آتی ہے کہ تخلیق میں ان اشیا کا کردار وسیع ہے اور ہم اشرف ہونے کے باوجود ان کے سامنے بے بس ہیں۔ مگر گھوڑے، عقاب، کوّے اور شیر کی مثال دینا کیا معنی رکھتا ہے— ؟ اگر بادشاہ کے لئے درکار صفات ان جانوروں میں ہیں تو ہم انہیں جانور کیوں کہتے ہیں— ؟ پھر بادشاہ اور گھوڑے میں، بادشاہ اور شیر میں، بادشاہ اور عقاب میں اور بادشاہ اور کوّے میں کیا فرق ہوا— ؟

دلیل پر وزیر گہری سوچ میں گم ہو گیا جب کہ دیگر لوگوں کے چہروں پر سنجیدگی چھا گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک حکیم نے الفاظ ترتیب دیئے۔ بادشاہ سلامت! آپ کا وقار بلند ہو۔ قدرت نے ہر مخلوق کو اچھی عادات اور اوصاف سے نوازا ہے۔ البتہ جانوروں میں معاشرتی قواعد نہیں ہیں، اس لئے ان کو جانور کہتے ہیں۔

بادشاہ نے آہستہ سے سر نفی میں ہلاتے ہوئے تردید کی۔ حکیم صاحب! اگر ایسی بات ہے تو شیر شیروں کے درمیان میں رہتا ہے، بکریوں میں نہیں بیٹھتا۔ ہاتھی کا غول ہرنوں سے الگ ہے، بندر لومڑی جیسا چالاک ہے مگر دونوں ساتھ نظر نہیں آتے۔ ہر جانور جانتا ہے کہ کس کی قربت اختیار کرنی ہے تاکہ اس کا تشخص متاثر نہ ہو۔ شیر، بندر، ہاتھی، لومڑی، کتّا، بلی سب کے اپنے اپنے علاقے ہیں، دوسرا اس حدود میں گھر نہیں بناتا۔ فرق قواعد کا نہیں ہے، قواعد جانوروں میں بھی موجود ہیں۔

کسی نے کہا، جانوروں میں شرم وحیا نہیں ہے۔

بادشاہ نے کہا، ٹھیک ہے لیکن جانور جب حمل کے آخری ایام میں ہوتے ہیں تو ہجوم سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ شیر خونخوار درندہ ہے مگر بھوک سے زیادہ کھانا نہیں کھاتا۔ شرم وحیا کیا ہوتی ہے، کیا ہم واقف ہیں— ؟

حکما جانتے تھے کہ بادشاہ دانا ہے، ظاہری باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ قائل کرنا مشکل ہو سکتا ہے۔

درمیانی نشست پر بیٹھا شخص کھڑا ہوا اور بولا، جناب عالی! ہم خود کو چھپاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ معاشرہ میں اخلاقی قدریں متاثر نہ ہوں۔ ناانصافی، بدعنوانی، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی سے پاک معاشرہ ہوتا کہ عدم توازن اور بے راہ روی نہ پھیلے، یہ سب

شرم وحیا کے تقاضے ہیں۔

وزیر خاص کو خود اپنی وضاحت بے تکی محسوس ہوئی کیوں کہ اسے بولتے ہوئے احساس ہو گیا تھا کہ اچھے معاشرہ کی جو خصوصیات اس نے بیان کی ہیں، وہ جانوروں میں موجود ہیں۔

بادشاہ بولا، بتاؤ کون سا جانور ملاوٹ اور بدعنوانی کرتا ہے، ذخیرہ اندوزی کر کے اپنی نوع کو کس نے نقصان پہنچایا ہے ــــ؟

وزیر نے تائید کرتے ہوئے کہا، میری دلیل کم زور ہے لیکن کوئی تو سبب ہے کہ ہم جانوروں سے بہتر ہیں۔ ہم خود کو چھپاتے ہیں، جانور نہیں چھپاتا۔

بادشاہ نے پوچھا، ہم خود کو کیوں چھپاتے ہیں اور جانور کیوں نہیں چھپاتا ــــ؟ جانتے ہو کیوں ــــ؟ ہم نے قوانین بنا لئے ہیں لیکن ہم قوانین کی پابندی نہیں کرتے اس لئے خود کو چھپاتے ہیں۔ جانوروں میں منافقت نہیں، وہ جیسے اندر ہیں، ویسے باہر نظر آتے ہیں۔ جانور ایک وقت میں ایک سے تعلق رکھتا ہے۔ آدمیوں میں بے راہ روی، ناانصافی اور بے اعتدالی کا خدشہ ہوتا ہے اس لئے شرم وحیا کے قوانین ہیں۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ــــ؟

وزیر نے ہاتھ سینہ پر رکھ کر سر ادب سے جھکایا۔

بادشاہ: پھر ایسے کیوں نہیں کہتے کہ آدمی جانور اور جانور آدمی ہے ــــ؟

وزیر اور حکیم آدمی اور جانور کو یکساں درجہ دینے سے انکاری تھے۔ محتاط لہجہ میں بولے، جناب والا! جانور چیر پھاڑ کر کھاتے ہیں، ان کے یہاں درندگی ہے۔

بادشاہ زیرک اور حاضر جواب تھا۔ اس نے کہا، جانور دوسرے جانوروں کا شکار کرتے ہیں کیوں کہ وہ ان کی خوراک ہیں۔ اس کا درندگی سے تعلق نہیں۔ درندہ کا نام ہم نے اسے دیا ہے۔ میں نے اللہ کے ایک دوست کا قصہ پڑھا ہے۔ وہ مریدوں کے ہم راہ سفر میں تھے کہ ایک مقام پر قیام کے دوران ممولہ کو باز کے شکنجہ میں دیکھا۔ باز اسے مغلوب کرنے کی کوشش میں تھا جب کہ ممولہ پوری طاقت سے خود کو آزاد کرنے کے لئے آخری دم تک لڑنے کو تیار تھا۔ بزرگ سے مریدوں نے درخواست کی کہ ممولہ کو آزاد کروائیں۔

انہوں نے حکم دیا، بزدل ممولہ! ہمت کر اور باز کو میرے پاس لے آ۔

حکم ملتے ہی ممولہ غالب اور باز مغلوب ہو گیا اور بزرگ کے سامنے باز کو حاضر کیا۔

بزرگ نے باز سے پوچھا، کم زور پر ظلم کرتے ہو؟

باز خاموش رہا لیکن غیب سے آواز آئی،

یہ اس کا رزق ہے!

آواز سنتے ہی وہ سنبھل گئے اور باز سے کہا، جاؤ اپنا کام کرو، اللہ کی مشیت میں دخل دینا میرا کام نہیں۔ میں تابع فرمان ہوں۔

دربار میں دانش وراس وضاحت کے بعد موزوں جواب تلاش کرنے کے لئے سوچ میں گم ہو گئے۔

بادشاہ نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا، تم چیر پھاڑ کی بات کرتے ہو۔ جانتے ہو کہ جانور ہم پر حملہ کیوں کرتا ہے —؟ اسے معلوم ہے کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ خرگوش معصوم صورت ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی بھاگتا ہے کیوں کہ ہمارے دل میں اس کا خوف نہیں ہے۔ کیا ہم چیر پھاڑ کر نہیں کھاتے —؟ ہم نے آلات اور مشینیں بنالی ہیں اور تہذیب کا لبادہ اوڑھ کر چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ جانوروں کے پاس مشینیں نہیں ہیں۔ ان کو آلات دے دو وہ بھی ہماری طرح مہذب ہو جائیں گے۔

ایک شخص پُر جوش لہجہ میں بولا، بادشاہ سلامت! جانور بات نہیں سمجھتے —؟ اس کا خیال تھا کہ وہ جواب تک پہنچ گیا ہے۔

بادشاہ نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا، کیا تم جانوروں کی بات سمجھتے ہو؟

وہ شخص بولا: نہیں۔

بادشاہ: پھر تم میں اور جانور میں کیا فرق ہوا —؟

وہ شخص گومگو کی سی کیفیت میں واپس بیٹھ گیا۔

بادشاہ: کیا جانور گونگے بہرے بن کے اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں؟ تمہیں پرندوں اور حیوانات کی مختلف آوازیں سنائی نہیں دیتیں —؟ ان کی آوازوں میں اتار چڑھاؤ محسوس نہیں ہوتا —؟ کیا تمہیں افریقی، ہسپانوی، جرمن، چینی اور اپنی ثقافت سے باہر لوگوں کی زبانیں آتی ہیں —؟ سب نے انکار کیا۔

بادشاہ: جن کی زبان سے تم نا آشنا ہو کیا اس بنا پر انہیں تہذیب یا زبان سے عاری کہو گے؟ اپنی لاعلمی کو دوسروں پر قیاس کرنے سے بڑی لاعلمی کیا ہے!

میں آپ کے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

سب نے گردن اس طرف موڑی جہاں سے آواز آئی تھی۔ وہ ایک بزرگ حکیم تھے جنہوں نے تحمل سے ساری گفتگو سنی اور آخر میں بات کرنا مناسب سمجھا۔

بادشاہ: ٹھیک ہے، پھر آپ ہی آدمی اور جانور میں فرق بتائیے اور یہ بھی کہ زمین پر حقیقت میں بادشاہت کے لئے کیا اوصاف ہونے چاہئیں —؟

بزرگ حکیم: اللہ نے نوع آدم کو زمین پر حاکم بنایا ہے۔ ارضی و فلکی مخلوقات اس کے لئے مسخر کر دی ہیں لیکن ہماری ناعاقبت اندیشی ہے کہ ہم نے زمین پر اپنے منصب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اسفل سافلین میں چلے گئے۔

بادشاہ اس محفل میں پہلی بار مسکرایا۔ وہ جان گیا تھا کہ بزرگ کے پاس سوال کا جواب ہے۔

بزرگ حکیم: میں جو بات کہنے جا رہا ہوں، ممکن ہے کہ آپ کو ناگوار گزرے لیکن حقیقت یہی ہے۔ آپ ایک ملک کے بادشاہ ہیں، زمین پر بادشاہ نہیں! اور ملک کے بادشاہ بھی آدمیوں کے بنائے گئے قوانین کی وجہ سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو زمین پر بادشاہت دی ہے، وہ اور لوگ ہیں۔ ان ہستیوں کو ''احسن تقویم'' کہا گیا ہے۔

بادشاہ سلامت! جانور اور آدمی کے تقاضوں میں فرق نہیں۔ دونوں کی جبلت ایک ہے لیکن — فطرت ایک نہیں ہے۔ اللہ نے نوع آدم کے اندر ایک رخ ''احسن تقویم'' رکھا ہے۔ احسن کا مطلب عمدہ اور بہترین ہے۔ تقویم کے معنی مقداریں ہیں۔ کون و مکان میں جتنی وسعت انسان کی مقداروں میں ہے، کسی مخلوق میں نہیں۔ انسان کی سکت یہ ہے کہ اگر وہ کائناتی فارمولوں کا علم حاصل کرلے تو اللہ کے حکم سے کائنات میں کسی بھی شے میں تصرف کرسکتا ہے۔

بزرگ کی آواز دربار میں گونج رہی تھی۔ سب دم بخود سن رہے تھے۔ انہوں نے آیات پڑھیں،

''رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کرنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔ آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کردی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔ زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لئے بنایا اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں اور طرح طرح کے غلّے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔ پس اے جن و انس! تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اس نے انسان کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پس اے جن و انس! تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟'' (الرحمٰن: ۱-۱۶)

جناب! ان آیات میں جن مقداروں کا ذکر کیا گیا ہے، احسن الخالقین اللہ تعالیٰ نے ان ساری مقداروں پر اپنی رحمت سے ''انسان'' کو تصرف کا اختیار دیا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

یہ کہہ کر بزرگ حکیم بے نیازی سے نشست پر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے کھڑے ہوکر پُرجوش لہجہ میں کہا، بہت خوب! مجھے ایسے ہی شخص کی تلاش تھی جو بتائے کہ میں خود کو بادشاہ کہتا ہوں لیکن میں تو نائب بھی نہیں ہوں! بادشاہ صرف ایک ہی ذات ہے جس نے ہم سب کو تخلیق کیا اور ہمارے لئے وسائل فراہم کئے اور نائب وہ ہے جس نے اپنے اندر موجود قدرت کی نشانیوں پر غور کرکے اس علم کی طرف توجہ دی جسے بیان کرنا اللہ نے ''انسان'' کو سکھایا ہے۔

کنفیوشس نے ایک شاگرد سے کہا، دل چاہتا ہے کہ میں بات کرنے سے پرہیز کرسکوں۔

شاگرد بولا، استاد! آگر آپ نے بات نہ کی تو ہم شاگرد آگے کیا منتقل کریں گے؟

کنفیوشس نے کہا، کیا آسمان بولتا ہے؟ اس کے باوجود چاروں موسم باری باری آتے ہیں اور تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ کیا آسمان بولتا ہے؟

دیکھنے کی جسے تمنا ہو

روایت ہے کہ ایران کے ایک شہزادہ نے مصرعہ کہا، ''درِّ ابلق کسے کم دیدہ موجود''۔

ترجمہ: تھوڑا سیاہ اور تھوڑا سفید موتی کسی نے کم دیکھا ہوگا — یعنی اس طرح کا دو رنگا موتی موجود نہیں۔

اس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ موزوں نہ ہوسکا۔ کئی شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن ناکامی ہوئی۔

شعر کی خبر دہلی کی علمی محفلوں اور شاہی محلوں میں پہنچی۔ وہاں بھی کوشش ہوئی لیکن مصرعہ موزوں نہ ہوا۔

ایک روز شہزادی زیب النسا سرمہ لگا رہی تھیں۔ آنکھوں میں پانی آ گیا۔ پانی دیکھ کر زبان سے جو مصرعہ ادا ہوا اس میں دوسرا مصرعہ موجود تھا۔

درِّ ابلق کسے کم دیدہ موجود
مگر اشک بتانِ سرمہ آلود

ترجمہ: تھوڑا سیاہ اور تھوڑا سفید موتی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ مگر ہاں! محبوب کی سرمگیں آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو ایسا موتی ہے جس میں دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔

زیب النسا — بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی پہلی اولاد تھیں۔ 1638ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں اور 1702ء میں انتقال ہوا۔ ذہین و فطین تھیں۔ فلسفہ اور علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ عربی و فارسی پر دسترس تھی۔ فارسی زبان میں شاعری کی — تخلص ''مخفی'' تھا۔ مجموعۂ کلام موت کے بعد ''دیوانِ مخفی'' کے نام سے شائع ہوا۔

شہزادی کے مصرعہ موزوں کرنے کی کاوش کو سب نے سراہا اور شعر ایران بھیجا گیا۔ وہاں سے جوابی خط آیا کہ اس شاعر کو ایران بھیج دیں، شہزادہ ملنا چاہتے ہیں۔ جواب میں شہزادی نے لکھا،

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

ترجمہ: پھول کی خوش بو، پھول کے پتّے میں مخفی ہے۔ اسی طرح میں اپنے کلام کے اندر ہوں۔ جسے دیکھنے کی تمنا ہو، میرا کلام پڑھ لے۔

ڈاکٹر نعیم ظفر

خمیر کیا ہے ــــ؟ پھیلنا سمٹنا

پہلی قسط کے نکات مختصر پیش خدمت ہیں ــــ اس دنیا میں ہر روپ مٹی کے خمیر کا خمار ہے۔ خمیر عناصر سے مرکب ہے اور عناصر نمبروں کی خاص ترکیب ہے جو مختلف حسابی طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ان میں ایک طریقہ لوگارتھم ہے جسے مشہور مسلم ریاضی دان عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی نے وضع کیا ہے۔ لوگارتھم سے مقداروں کے پھیلنے اور سمٹنے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پھیلنا اور سکڑنا خمیر کے سبب ہے۔ گھٹنے اور بڑھنے کی اطلاع سے شے کی نشوونما ہوتی ہے اور ان مراحل سے عمر کی پیمائش کی جاتی ہے۔ باطنی علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ہر وہ پیمائش جسے آدمی محدود حواس میں محسوس کرتا ہے، فکشن ہے۔ جسم خلیات سے بنتا ہے۔ ان خلیات کو کیڑے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کیڑوں کو ہم بیکٹیریا کے نام سے جانتے ہیں۔ بیکٹیریا نہ ہو تو خمیر کی دنیا زیر بحث نہیں آئے گی۔ اب آگے پڑھیے۔

پیدائش سے موت کے درمیان فرد کی مختلف اشکال خمیر کا عمل ہے۔ دودھ اور دہی خمیر سے بنتا ہے۔ آٹا گوندھنے میں خمیر استعمال ہوتا ہے جو آٹے کو پھلا دیتا ہے۔ سفید چنوں میں ڈالا جانے والا میٹھا سوڈا خمیر ہے۔ روزمرہ استعمال میں اچار، دہی، تندوری روٹی، پیزا اور اس جیسی دوسری خوراک میں خمیری عمل (گھٹنا بڑھنا) شامل ہے۔ خمیر کا استعمال ہر دور اور قوم میں ہے۔

۱۔ افریقی قبائل کی غذا ''قساوا'' زمین میں گڑھا کھود کر نرم اور شیرینی سے بھرپور بنائی جاتی تھی۔

۲۔ قطب شمالی پر مچھلی کو برف کی مدد سے اتنا سڑا دیا جاتا ہے جیسے آئس کریم۔ اسے آئس فش کہہ سکتے ہیں۔ آئس فش کا انوکھا اور مرغوب ذائقہ صدیوں سے قطب شمالی کی برفانی ہواؤں میں رہنے والوں کی غذا ہے۔

شے میں خمیر کو نمایاں کرنے کا عمل زمانۂ قدیم سے مختلف شکلوں میں رائج ہے۔ غرضیکہ عملِ خمیر کی تاریخ اتنی پرانی ہے، جتنی مخلوقات کی تاریخ ہے۔

زمانۂ قدیم میں بہت سی جڑی بوٹیوں اور گوشت کے ملے جلے آمیزے کے خمیر سے ایسے مرکبات تیار کئے جاتے تھے جو رسومات اور تہوار کے دوران استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح کی خمیری غذاؤں کی بہت سی اقسام فی زمانہ دسترخوان کی زینت ہیں جیسے

اچار، کیچپ، کھیرا، پیاز، زیتون، کھجور کا شربت اور سرخ وسفید مشروب وغیرہ۔

خمیر کی بنیاد میں پانی کا کردار اہم ہے۔ یہی کردار ہمیں زمین کی گہرائی میں دبے ہوئے fossils (پودوں اور جانوروں کی باقیات جو زمین میں دبی رہ جاتی ہیں) سے لے کر کوئلے، نمک اور دھات وغیرہ میں ملتا ہے۔ حتیٰ کہ لاوے کے بننے، ابلنے اور بڑے بڑے بلبلے بننے میں بھی خمیری عمل کارفرما ہے۔

تقریباً بارہ ہزار سال پہلے براعظم افریقا، اسپین اور لاطینی امریکا کے غاروں میں ایسی پینٹنگز کندہ کی گئیں جن میں شہد کو خمیر لگانے کا طریقہ دکھایا گیا ہے۔

خالص شہد پانی میں حل کر کے کھلی ہوا میں رکھیں تو شہد کے ذرّات میں پیدا ہونے والا خلا ہوا میں سے نئے نئے کیڑوں کو اپنے اندر داخل کر لیتا ہے۔ ان کیڑوں کو آپ بیکٹیریا کہیں، خمیر (yeast) یا کچھ اور، شہد کے آمیزہ میں خمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آمیزہ پھولنے کی رفتار ہر لمحہ دوگنا، چار گنا اور آٹھ گنا بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح کی رفتار کو اسکولوں میں لوگارتھم رفتار کہتے ہیں۔ آمیزہ پھولتا جاتا ہے جسے ''خمیری شہد'' کہتے ہیں۔ اس کی مٹھاس الکحل اور کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بدل جاتی ہے۔ قدیم چین میں منگول اسے ''میڈ'' یا مقدس شراب کہتے تھے۔

میڈ پرخمار مشروب ہے جس کی تاریخ آگ کی دریافت سے پرانی ہے۔ آدمی نے درخت کے کھوکھلے حصہ میں بارش کے شفاف پانی سے بلبلے نکلتے دیکھے۔ خوف لیکن تجسس سے انگلی سے چھوا — ذائقہ محسوس کیا تو ارد گرد کی دنیا انوکھی لگنے لگی۔ اس طرح درخت کے کھوکھلے حصہ میں پلنے والا مشروب ''میڈ'' تہوار کا مقدس جزو بن گیا۔

فی زمانہ ماہرین آگ کے بغیر تیار ہونے والے اس مشروب کو، نوع آدم کے دورِ تہذیب میں داخل ہونے کا ایک اہم قدم بتاتے ہیں۔ بعد ازاں قدرتی طور پر بننے والے اس مشروب کی بڑے پیمانہ پر تیاری شروع ہوئی جو بالآخر آج بڑی صنعت بن گئی ہے۔

کتاب ''پیرامڈ کے باسی'' میں مصر اور مایہ تہذیب کے مُردوں کو حنوط کرنے کا طریقہ درج ہے۔ وہ شہد کی شراب سے مُردے کا پیٹ دھوتے تھے اور اس مشروب کو ''بلاشے'' کہتے تھے۔ عقیدہ تھا کہ یہ مردہ جسم کو کالی طاقتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ بعد ازاں الہامی مذاہب میں اس کی ممانعت کے باعث طریقہ متروک ہو گیا۔

خمیر ایسا طرزِ عمل ہے جو مسلسل گھٹنے اور بڑھنے کے سائیکل سے گزرتا ہے یعنی یہ مظاہرہ کی فلکشن طرز ہے۔

جب آدمی نے بیل، گھوڑے، اونٹ، بھیڑیں، بکریاں اور دیگر مویشی پالنے شروع کئے تو ان جانوروں کے دودھ، گوشت اور اون میں خمیر کی مختلف شکلیں نظر آئیں۔ دودھ سے دہی، مکھن، لسی اور پنیر بنایا جانے

لگا۔ ہر دور میں دسترخوان پر خمیری مرکبات کی کثرت رہی ہے۔سوپ، سلاد، مین کورس اور سویٹ ڈش سے لے کر آخری جام تک خمیر کا ہی خمار نظر آتا ہے۔

محققین ہر دور میں خمیر کے عمل میں کارفرما عوامل کی نشان دہی میں متذبذب رہے۔ گو کہ اس زمانہ میں یہ دعویٰ مضحکہ خیز لگتا ہے مگر یہ آدمی کے ذہنی ارتقا کا سفر ہے۔مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

تیرھویں صدی میں چرچ کے ایک عہدہ دار جین ہیلمنٹ نے کہا،'' اگر میلی قمیص کو مٹی کے برتن میں رکھ کر بند کر دیں تو اکیسویں دن اس میں چوہے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں''۔ قبل مسیح میں یونان کے معروف حکیم ارسطو کا کہنا تھا کہ مینڈک کیچڑ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چودھویں صدی میں دانش وروں نے اسی طرح بچھو کے پیدا ہونے کی توجیہ پیش کی۔

پندرھویں صدی میں رینی ڈسکارٹس راہب نے تقریر میں کہا ،'' کائنات ایسا میکانکی نظام اور مشین ہے جس میں ایک پرزہ دوسرے پرزہ میں حرکت کا سبب بنتا ہے اور پوری مشین متحرک ہے۔''

یہ وہ دور تھا جب مغرب میں فلاحی مملکت کا تصور نہیں تھا، آدمی بازار میں بکتا تھا، تہذیب وثقافت ناپید تھی ،عوام بقا کے لئے مارے مارے پھر رہے تھے۔ مغربی ماہرین عمرانیات اس دور کو ڈارک ایج (سیاہ دور) کہتے ہیں۔

سولھویں صدی میں کیمیادان اپنے ہم عصر بعض محققین کے برعکس ہر نظام کو کیمیائی مساوات کی شکل میں دیکھتے تھے۔ جہاں مختلف کیمیائی مرکبات کے ری ایکشن سے نیا مرکب بنتا تھا اور ری ایکشن اور نتائج کے درمیان نادیدہ عناصر کی کوئی جگہ نہ تھی۔

سترھویں صدی میں مائیکرواسکوپ کے موجد لیون ہوک کا دور شروع ہوا۔اس کے خوردبینی مشاہدہ نے تحقیق کے ارتقا کی سمت بدل دی۔صدیوں سے رائج نظریات ڈھیر ہو گئے۔ واضح مشاہدات کے باوجود ہم عصروں نے لیون ہوک کی تردید کی۔

ٹھیک ایک صدی بعد جرمن محقق لی بگ نے نادیدہ yeast کی مدد سے کیمیائی کھاد بنا کر ثابت کیا کہ خمیر کا عمل نادیدہ عناصر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صنعتی پیمانہ پر کھاد بنانا چیلنج تھا۔ لی بگ کے طریقہ کار کو صنعتوں نے وسیع پیمانہ پر کھاد کی پیداوار کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے،

'' yeast کا مردہ بدن شکر اور پانی سے مل کر خمیر کے مدارج سے گزرتا ہے اور سڑاند کے نتیجہ میں کھاد بن جاتی ہے۔''

گڑ آج بھی ریگستانی زمین میں درخت اگانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے مقامات سے گزریں تو کھیتوں سے اٹھنے والی بو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لی بگ کے مطابق اس بو کا ماخذ سڑاند ہے۔

رائج تحقیق کی تاریخ میں ایسے بہت سے نظریات

ہیں جنہیں صنعتی معاونت نہ ہونے کے باعث قبولیت نہیں ملی۔ ایسا بھی ہوا کہ نظریہ پیش کیا گیا اور صدیوں بعد ہزاروں کلومیٹر دور کسی اور نے اس سے استفادہ کیا اور ٹیکنالوجی کی شکل دے دی جو آج بھی ہو رہا ہے۔

قدرتی طور پر پیدا ہونے والی اشیام (پھل، بیج وغیرہ) میں خمیر کا توازن قائم رہتا ہے، پھل پکتے ہیں اس کے بعد انحطاط کا دور آتا ہے۔

چاکلیٹ اور کافی کی تیاری میں عمل خمیر کا طریقہ مختلف ہے۔ کافی اور چاکلیٹ کے بیج کو نپل یا پودے سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان کے قدرتی سائیکل کو روکنے کے لئے انہیں بلند درجۂ حرارت پر گرم رکھا جاتا ہے جس سے خمیری عمل کی رفتار کم سے کم ہو جاتی ہے۔ اگلے مرحلہ میں پانی اور ہوا کی مدد سے خمیر کے مصنوعی عمل کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ عمل سڑاند کے مشابہ ہے۔ خمیری عناصر میں کمی بیشی سے چاکلیٹ میں دل پسند ذائقے اور کافی میں خوش بو حاصل کی جاتی ہے۔

خمیری عمل سے خلیات یا نادیدہ کیڑوں میں شکست و ریخت ہوتی ہے۔ یہ مخلوقات کی وضع قطع اور ظاہری خدوخال حتیٰ کہ جبلی رغبت کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں ان کیڑوں (بیکٹیریا) سے آدمی اور دیگر مخلوقات کے اجسام بنتے ہیں۔ سوال ہے کہ ان خلیات اور کیڑوں کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ شیر خوار آدمی کا بچہ اور بلی کے بچے میں گردوں کا تناسب کیا ہوگا جب کہ دونوں میں مذکورہ عضو کا کام ایک ہے ــــ؟

کیمیادان خمیری عمل میں کاربن اور کاربن کے مرکبات کو اہم جز قرار دیتے ہیں۔ نامیاتی کیمیا میں کاربن اور ہائیڈروجن جیسے عناصر کی مختلف ترتیب سے آرگینک یا نامیاتی مرکبات بنتے ہیں۔ کاربن کی بہت سی صفات ہیں۔ جن محققین پر کاربن کی صفات کسی نہ کسی حد تک منکشف ہوتی ہیں، وہ اس کی نامیاتی ترکیب میں عملِ خمیر کی مدد سے طرح طرح کے دوسرے مرکبات حاصل کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں دخان کا ذکر ہے۔ محققین نے دخان کو کاربن کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کاربن ایسا کیڑا (جیسے خلیہ یا بیکٹیریا) ہے جس کے چاروں طرف دوسرے ہم شکل کیڑے چپک سکتے ہیں۔ یہ چپک ایک جال بناتی ہے جیسے گلوکوز، الکحل، چینی، بینزین وغیرہ۔ محققین کے بقول جسے ہم شے کی زندگی کہتے ہیں وہ کاربن کی بدولت ہے۔

عام طور پر درسی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ جلنے کے عمل میں آکسیجن کا کردار ہے ــــ مگر ہم نائیٹروجن کی کمی بیشی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ طرز کوئی بھی ہو، جب کاربن کی مقدار شے کے متعین کردہ تناسب سے گھٹ جاتی ہے تو شے کا ظاہر معدوم ہو جاتا ہے۔

(قسط: ۲)

عابد محمود

گوبھی کا پھول

اس نے غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے بالوں کو ماضی سے تشبیہ دیتے ہوئے اگرچہ اپنی فراست کا ثبوت دیا تھا، کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے ضرور داد دیتا لیکن میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

غلافی آنکھوں والی لڑکی نے چائے کی پیالی مجھے پکڑائی اور میں دیکھتا رہ گیا۔ پاس بیٹھی بہن نے زور سے پسلیوں میں کہنی ماری۔ چائے میرے ہاتھ میں ہلکورے لے کر رہ گئی۔ پسلیوں میں ٹیس اٹھنے سے حلق سے گھٹی ہوئی آواز ''ہائے'' نکلی۔ سامنے بیٹھی لڑکی کی کزن ہائے کو غلط معنی پہناتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ ہم لوگ رشتہ دیکھنے لڑکی والوں کے گھر آئے ہیں اور مجھے حتی الامکان اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

میں نے ہائے کے ساتھ فوراً ایک اور ہائے جوڑا اور بولا، ہائے ہائے کیا مزہ دار چائے بنائی ہے۔

لڑکی کی کزن کے تاثرات معمول پر آتے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ایک دفعہ ہائے لڑکی کے لئے اور دو دفعہ ہائے ہائے چائے کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔

شادی والے دن دلہن کی پھوپھو نے مجھے پہلی بار دیکھا تو میری رنگت کو جلے ہوئے نصیب سے تشبیہ دیتے ہوئے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولیں، ہائے! میری بھتیجی کے نصیب جل گئے۔ میں سمجھ گیا کہ ہائے صرف چائے کی تعریف میں نہیں، دل جلے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ بس ہر بار ''ہائے'' کے معنی کا تعین ادائیگی سے ہوتا ہے۔

اپنی دبی ہوئی رنگت اور اُس کے خوب صورت نین نقش، دراز گیسو اور میدہ جیسی خوب صورت رنگت دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ رشتہ نہیں ہوگا لہٰذا کافی دن غمگین گانے سننے میں گزرے۔ بقول شاعر،

اس کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
میری سیرت وہ دیکھتا ہی نہیں

پھر خبر آئی کہ لڑکی نے مجھے پسند کرلیا ہے۔

مجھے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

تذبذب میں اماں کے پاس گیا اور پوچھا کہ اماں! کہیں وہ بچپن میں سر کے بل تو نہیں گری تھی—؟

نہیں پتر! ماشاء للہ پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہے مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔

کہاں وہ کہاں میں! اماں، وہ کتنی حسین ہے۔ یہ رشتہ کیسے قبول کرلیا؟ اندیشہ کو زبان پر لے آیا۔

اماں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا، لے پتر! اس کو اور کیا چاہئے۔ ماشاء اللہ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ ایسے چاند بیٹے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ اس کے بخت جاگے ہیں کہ تجھے پسند کرلیا ورنہ مجھے تو وہ لڑکی واجبی لگی۔ پتر میں نے دل پر پتھر رکھ کر اس کو قبول کرلیا ہے۔ تیری بہن اور ابا کو پتہ نہیں کیسے پسند آ گئی۔ تیرے لئے تو حور پری ہونی چاہئے تھی۔

میں نے حیران ہو کر اماں کو دیکھا، خاموشی سے گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈالا اور اماں کی طرف بڑھایا۔ لڑکی کی دماغی حالت پر تو شبہ تھا، اب اماں کی صحت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ سارا دن مجھے باتیں سنانے والی اماں کو آج میں چاند نظر آیا۔ بہرحال اب میں نے غمگین گانے چھوڑ کر رومانوی گانے سننے شروع کر دیئے۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے، ہزار کوششوں کے باوجود میری رنگت ہنوز جلی ہوئی تھی۔ گورا کرنے والی کریمیں چہرہ پر لگ کر کالی ہو جاتی تھیں۔ مجھے اپنے بالوں کا اسٹائل اچھا لگتا تھا۔ نرم، سلکی اور چمک دار بال ہوا کے جھونکے سے ہلتے اور ماتھے پر آتے ہوئے آنکھوں کے سامنے لہراتے تو میں انہیں پھونک مار کر ہٹاتے ہوئے خود کو فلم کا ہیرو سمجھتا۔

رنگت نکھارنے کے لئے دینو نائی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ پورے قصبہ میں واحد آدمی تھا جو کہتا تھا کہ کشش سیاہ رنگ میں ہوتی ہے، گورا تو گوبھی کا پھول بھی ہوتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ سیاہ رنگت کو نکھارا جائے تو کشش زیادہ ہو جاتی ہے۔

دینو نائی کی دکان پر پہنچا۔ موٹر سائیکل کھڑی کی اور اڑتے ہوئے بالوں کو پھونک مار کر سیٹ کرتے ہوئے دکان کی طرف بڑھا۔ دکان کے باہر محو استراحت کتّے نے آدھی آنکھ کھول کر مجھے دیکھا اور غیر متوقع طور پر زور سے بھونکنے لگا۔ میں تیزی سے دکان میں داخل ہوا۔ دینو نائی محلّہ کے بدمعاش جورے کی آدھی مونچھ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھڑا تھا جب کہ جورے کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔

دینو نے ہکلاتے ہوئے کہا، جورا جی! یقین کریں میں ہوش وحواس کے ساتھ احتیاط سے آپ کی مونچھوں کے اتار چڑھاؤ درست کر رہا تھا مگر کتّے کے بھونکنے سے جب آپ ہلے تو استرا 180 کا زاویہ لیتے ہوئے مخالف سمت میں مڑ گیا۔

جورے نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح تولیہ ہٹاتے ہوئے دینو کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ تم نے میری مونچھ اتاری ہے جس سے سارا محلّہ ڈرتا تھا۔ مونچھ اتار کر مجھے بھرے بازار میں عریاں کر دیا ہے۔ اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ دن رات مونچھوں کو مکھن لگا لگا کر بڑا کیا اور تم نے استرے کے ایک وار سے محنت پر پانی پھیر دیا۔

جورے بدمعاش کی ناک کے نیچے ایک طرف خالی میدان اور دوسری طرف جھاڑیاں تھیں۔ناک کے نیچے ہونے والی واردات نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔اپنی بدمعاشی کا ٹریڈ مارک مٹ جانے پر جورا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ بہت دیر بحث وتکرار کے بعد دینو نائی نے جورے کو باقی رہ جانے والی مونچھ صاف کرنے پر آمادہ کرلیا۔ جورے کے جانے کے بعد دینو کی جان میں جان آئی۔

میں نے کہا، دینو! میری شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔اس چہرہ کا بھی کچھ کرلو۔

وہ بولا، بھائی میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے چہرہ کا دھیان رکھا کرو،تم نہیں جانتے کہ تھوڑی محنت سے رنگت نکھر سکتی ہے۔

دینو لاہور میں ہر بڑے فلمی ہیرو کے بال تراش چکا تھا۔وہ کہتا تھا کہ فلمی ہیرو اتنے خوب صورت نہیں ہوتے ہیں جتنے وہ فلموں میں نظر آتے ہیں۔ یہ سب ان کے نائی کا کمال ہے ۔ ہیرو بھی ہیروئن کی طرح تیار ہوتے ہیں۔چہرہ پر چمک لانے کے لئے فیشل کرواتے ہیں،بھنویں بنواتے ہیں۔مینی کیور، پیڈی کیور اور تھریڈنگ کرواتے ہیں۔اسکرین کی ضرورت کے مطابق ہونٹوں پر ہلکی سرخی لگاتے ہیں پھر کیمرے کے سامنے آتے ہیں۔

بھائی یہ فیشل، مینی کیور اور پیڈی کیور کیا بلا ہے؟

دینو بولا،شادی والے دن بارات سے چھ گھنٹے پہلے آجانا۔ایسا بنادوں گا کہ پہچانے نہیں جاؤ گے۔

شادی سے دو ہفتہ پہلے مجھے شیو کرنے سے روک دیا گیا۔میرے کزن اور بہن نے حکم نامہ جاری کیا کہ بارات والے دن سے پہلے شیو نہیں کرو گے۔وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ دیکھو! جب دو ہفتہ بعد شیو کرو گے تو روپ چڑھے گا۔ دیکھنے والوں کو پہلے سے بہتر لگو گے۔بہن نے فلسفی بننے کی کوشش کی۔

شادی کے دن بارات سے پانچ گھنٹے پہلے میں دینو کی دکان پر تھا۔اس نے سب سے پہلے روئی پر ٹونر لگایا اور میرے چہرہ پر پھیرنے کے بعد مسکراتے ہوئے مجھے روئی دکھائی تو روئی میلی ہوگئی تھی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا، کیا میرا رنگ اترا ہے؟

نہیں! سارا دن دھول مٹی جلد پر پڑنے سے مساموں میں جمع ہوتی ہے۔ یہ وہی گرد ہے جو غبار بن کر اتر رہی ہے۔پھر اس نے کریم لگا کر چہرہ پر مساج کیا۔ پندرہ منٹ تک ہر طریقہ سے میرے گالوں کو سہلا کر جب اسے احساس ہوا کہ وہ دکان پر کھڑا ہے تو چہرہ کو تولیہ سے صاف کرتے ہوئے بولا، اب بلیچ لگاؤں گا اس کے بعد تم آئینہ دیکھنا۔

بلیچ کا نام سن کر اماں یاد آگئیں۔ وہ کپڑوں پر لگے نشان بلیچ میں صاف کرتی تھیں۔

دینو نے پیسٹ بنایا اور آنکھیں بند کرنے کا کہا۔ پھر میری آنکھیں اور بھنویں چھوڑ کر چہرہ پر برش پھیرنے

لگا۔ کچھ دیر بعد چہرہ پر جلن کا احساس ہوا۔ زبان سے بے ساختہ دینو کی شان میں کلمات ادا ہوئے،

تیرا بیڑا غرق ہو دینو!

وہ ہنس پڑا اور آنکھیں کھولنے سے منع کیا۔

پندرہ سے بیس منٹ بعد دینو نائی نے میرا چہرہ صاف کیا اور آئینہ سامنے کر دیا۔ رنگت نکھر گئی تھی اور چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے اپنی محنت کا نتیجہ آنے پر فخر سے کہا، خوب صورتی رنگ سے نہیں، چمک سے پیدا ہوتی ہے ورنہ سفید تو گوبھی کا پھول بھی ہوتا ہے۔

میں نے مطمئن ہو کر آنکھیں کرسی کی پشت سے لگا لیں اور دینو سے کہا، بھائی اب بال بنا دو۔ تین گھنٹے بعد میری شادی ہے۔ وہ مستانہ لہجہ میں بولا، ٹھیک ہے ہیرو، اب تمہارے بالوں کو سیٹ کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ برا وقت بتا کر نہیں آتا۔ سب کچھ بہت اچھا ہو رہا تھا۔ دینو نے بالوں کی بہترین تراش خراش کی پھر ماتھے پر چھوٹے بالوں کو صاف کرنے کے لئے استرا پکڑا اور احتیاط سے بال ترتیب دینے لگا۔

اچانک دکان کے باہر محو استراحت کتّے کو راہ چلتے کسی منچلے نے پتھر مارا تو ماحول میں یک دم کتّے کی پُرسوز آواز سے دینو کے استرے کے بریک فیل ہوتے چلے گئے اور میرا سر درمیان تک صاف ہو گیا۔ میں اس آفت پر بوکھلایا اور مجھے جورابد معاش یاد آ گیا۔

میرے ساتھ دینو کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ سر کے عین درمیان میں کوئی تین انچ کی راہ داری بن گئی تھی جو دونوں طرف گھنے اور سلکی بالوں کے درمیان پگڈنڈی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

دینو کے بچے! آج میری شادی ہے۔

میں نے غصہ سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

میں کتّے کے بھونکنے سے ڈر گیا تھا۔ وہ گھگیائے ہوئے لہجہ میں بولا۔ لیکن تم فکر نہیں کرو، آج کل ٹنڈ کا فیشن ہے، گول چہرہ پر ٹنڈ جچے گی اور پھر آج تمہاری شادی ہے۔ ساری کشتیاں جلا کر نئی زندگی کا آغاز کرو۔

اس نے غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے بالوں کو ماضی سے تشبیہ دیتے ہوئے اگرچہ اپنی فراست کا ثبوت دیا تھا، کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے ضرور داد دیتا لیکن میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

دل چاہا کہ پہلے باہر بیٹھے ہوئے کتّے کا علاج کروں اور پھر دینو کو بتاؤں کہ کشتیاں کیسے جلاتے ہیں۔ اس نے مجھے اپنی دلہن کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ مجھے درزی کی نصیحت یاد آ گئی کہ کوٹ پتلون کی جگہ شیروانی بنا لو۔ شیروانی کے ساتھ کلاہ اچھی لگے گی۔ لیکن جدید سوچ، کلاسیکی سوچ پر غالب آ جانے سے میں کہیں کا نہ رہا ورنہ سر پر بنی راہ داری کو کلاہ کے نیچے چھپایا جا سکتا تھا۔ اب سوائے پوری ٹنڈ کے چارہ نہ تھا!

دینو کی دکان سے باہر آیا تو چہرہ کے ساتھ ٹنڈ بھی چمک رہی تھی۔ کتّے نے تھوڑی سی آنکھ کھول کر مجھے کن اکھیوں سے دیکھا اور مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔

میں اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔

گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو بہن نے اجنبی کو دیکھ کر دروازہ کی اوٹ سے کہا، بھائی گھر پر نہیں ہیں، آپ ادھر ٹینٹ کی طرف چلے جائیں، وہ آنے والے ہیں۔

میں نے کڑھتے ہوئے کہا، سر میرا صاف ہوا ہے اور یادداشت تمہاری چلی گئی ہے۔ بھائی ہوں تمہارا!

میرے بالوں کی طرح اس کا رنگ اڑ گیا۔ ہائے اللہ! کہہ کر وہ صدمہ سے بولی، شادی والے دن—؟

میں نے اسے بتایا کہ یہ ٹنڈ دینونائی کا کارنامہ ہے۔ بہن کو واقعہ سنانے کے بعد قائل کر لیا کہ کسی کو خبر نہ ہو ورنہ لڑکی والوں تک بات پہنچ جائے گی۔

بہن نے فوری طور پر سہیلی کے گھر سے اس کے بھائی کی شیروانی اور کلاہ منگوائی۔ میں نے شیروانی پہن کر سر پر لگنے والی ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بند کرتے ہوئے سر پر کلاہ پہن لی۔

بہن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد گوٹے والا دوپٹہ نکالا اور میری گردن پر لپیٹتے ہوئے کہنے لگی کہ یہ شگن کا دوپٹہ ہے اور اس وقت تک نہیں اتارتے جب تک دلہن گھر نہ آجائے۔

اپنی فلسفی بہن کو دیکھ کر شگن کی رسموں کی حقیقت کو سمجھ گیا۔ ہزاروں خامیاں شاید شگن کی مد میں شادی بیاہ پر چھپائی جاتی ہیں۔

نکاح سے کچھ دیر پہلے میں اسٹیج پر بیٹھا ٹنڈ پر جمع ہو جانے والے پسینے کے قطروں کے بہنے سے گدگدی محسوس کر رہا تھا کہ دیکھا، میرے ابا اور لڑکی کے والد میں بحث ہو رہی ہے۔ ہال میں بیٹھے مہمان ان کی طرف متوجہ ہونے لگے تو میں پاس گیا اور سوالیہ نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔

ابا دبدبہ سے بولے، تم اپنی جگہ پر جا کر بیٹھو۔

ابا نے جہیز کی مد میں رقم کا مطالبہ کر دیا تھا۔ مجھے ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ عین شادی کے روز کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے کہا، ابا خدا کے لئے اگر کسی خوب صورت لڑکی نے مجھ سے شادی کے لئے ہامی بھر لی ہے تو رانجھے کو ہیر سے جدا نہ کرو۔

لڑکی کے والد نے ابا کی منت کی کہ بھائی صاحب! طے شدہ جہیز کی رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ میں ایک دو دن میں انتظام کر کے آپ کے حوالہ کر دوں گا۔

جہیز کی بات سن کر میں سکتہ میں آ گیا۔ میرے گھر والے یہ سب کیسے کر سکتے ہیں؟

دکھ سے ابا کی طرف دیکھا اور پُرعزم لہجہ میں ہونے والے سسر سے کہا، میں جہیز کی مد میں ایک پائی نہیں لوں گا۔ نکاح جہیز کے بغیر ہو گا۔

میں نے سنا تھا کہ وہ بیٹی کے میرے لئے ہاں کہنے پر خوش نہیں تھے۔ مگر آج محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا، بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی

ہیں، میں آپ کی بیٹی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔ ابا میری بات سن رہے تھے۔ شاید انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

دل میں ہزاروں وسوسے تھے۔ میں نے دینو اور اس کی دکان کے باہر بیٹھے کتّے کو کوستے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ دلہن سمٹ گئی۔ میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا، لوگ کہتے ہیں کہ میں خوش شکل نہیں، رنگت واجبی ہے، تمہارے ساتھ میری جوڑی حور کے پہلو میں لنگور ہے۔

وہ ہنس دی۔ کمرے میں جل ترنگ بج اٹھے۔

وہ بولی، کیا تم اسی طرح کھری کھری باتیں کرتے ہو؟

میں بولا، تمہیں حور کہا ہے۔

اس نے بات مکمل کی، اور خود کو لنگور۔

میں ذہن سے اس الجھن کو دور کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ ساری زندگی احساس کم تری میں نہیں گزر سکتی۔ آج تین گھنٹے دینو کی دکان میں گزارے کہ کسی طرح رنگ چمک جائے اور میں تمہارا جوڑی دار لگوں۔ لیکن —!

سر پر سے کلاہ اتارتے ہوئے کہا، دینو نے ذرا لحاظ نہیں کیا اور کہا، کشتیاں جلا کر نئی زندگی کا آغاز کرو۔

دلہن ہنسی روک نہ سکی۔

میں بھی نہ چاہتے ہوئے مسکرا دیا۔

اس نے مترنم آواز میں کہا، رنگ اور صورت خیال رکھنے سے نکھرتے ہیں اور سر پر بال پھر آ جائیں گے لیکن دل کا کیا کریں — دل صاف نہ ہو تو چہرہ پر چمک ماند پڑ جاتی ہے اور اچھی اچھی صورتیں اہمیت کھو دیتی ہیں۔ رنگ خوش رہنے سے نکھرتا ہے اور چہرہ پُرکشش ہو جاتا ہے۔ آج تم نے جہیز سے انکار کر کے مجھے اور ہر لڑکی کو عزت دی ہے۔ ایسے دل کا کوئی مول نہیں۔ لہٰذا میرے لئے تم دنیا کے سب سے خوب صورت، وجیہ اور خوددار مرد ہو۔

عزیز دوستو! میں نے دلہن کی بات سن کر سکون کا سانس لیا کہ آئندہ کے لئے سولہ سنگھار سے جان چھوٹی کہ یہ شوق خواتین کو ہی زیب دیتے ہیں۔

البتہ میرا حضرات سے سوال ہے۔

خواتین خوب صورت ہونے کے باوجود واجبی صورت مردوں کو قبول کر لیتی ہیں۔ مرد ایسا کیوں نہیں کرتے؟

میرا خواتین سے بھی سوال ہے۔

آپ بیٹے کے لئے لڑکی دیکھنے جاتی ہیں تو لڑکیوں میں قسم قسم کے نقص نکالتی ہیں مگر اپنے ''چاند صورت بیٹوں'' کو نہیں دیکھتیں۔ جب کہ آپ خود اس دور سے گزر چکی ہیں۔ پھر خاتون ہو کر دوسری خاتون کے جذبات کا خیال کیوں نہیں رکھتیں —؟

یاد رکھئے!

ہم سفر جس کا خوب سیرت ہو
خوب صورت ہے زندگی اس کی

سرورق کی تشریح

(پرندوں کی کہانی، پرندوں کی زبانی پڑھئے)

پرندے جب شاخ پر مستغرق نظر آتے ہیں تو وہ وقت کو اندیشوں میں نہیں گنواتے بلکہ مراقب ہوتے ہیں کہ،

★ زمین پر پنجے رکھنے سے قبل کون ہے جو رزق کا انتظام کرتا ہے؟

★ پتّوں پر جمع ہونے والے شبنم کے قطروں کو کس نے ہمارے لئے صبح کا مشروب بنایا ہے؟

★ کس نے ہماری آنکھوں میں ایسے لینس لگائے ہیں کہ دور شے دوربین کے بغیر قریب آجاتی ہے؟

★ کون ہے جو ہمیں زمین کی کشش سے نکل کر فضا میں اڑنے کی طاقت دیتا ہے مگر جب ہم ان فضاؤں سے نکلنا چاہتے ہیں تو کس کے حکم سے زمین کی کشش ہمیں کھینچ لیتی ہے؟

★ تفکر جب نئی وسعتوں سے روشناس ہوتا ہے تو خیال آتا ہے کہ کیا یہ نیچے موجود فرش (زمین) کی کشش ہے جو ہمیں بلندی سے کھینچ لیتی ہے یا یہ ہمارے اندر زمین کے لئے کشش ہے جو اوپر جانے کے بعد جب ایک نظر نیچے کا تصور کرتی ہے تو اوپر جانے کا راستہ بھول جاتی ہے؟

خواتین وحضرات! ایسا تو نہیں کہ سرورق پر موجود پرندے بھی اسی گتھی کو سلجھانے جمع ہوئے ہیں—؟

جاننے کے لئے آگے پڑھئے۔ پرندے کہتے ہیں کہ،

جب ہم فضا کی وسعتوں میں پرواز کرسکتے ہیں تو ان وسعتوں سے باہر کیوں نہیں نکل سکتے؟

ایسا تو نہیں کہ یہ پرواز جس کو ہم آزادی سمجھ رہے ہیں، محض دھوکا ہے؟ اور ہم زمین سے اوپر آنے کے باوجود فضا میں نہیں، اپنے گرد گھوم رہے ہیں؟ اگر ہم زمین سے اوپر آگئے ہیں پھر زمین کی کشش نے ہمیں کیسے روک لیا؟ لگتا ہے کہ زمین کی کشش ہمیں گرفت میں لئے ہوئے ہے اس لئے ہم زمین سے بظاہر دور لیکن زمین پر ہیں۔

اور خود فضا کیا ہے—؟ اگر یہ فضا دائرہ ہے تو دائرہ میں ہماری شناخت کیسے قائم ہے؟

یہ دائرہ نہیں ٹرائینگل ہوسکتا ہے جس پر دائرہ محیط ہے۔

کیا ہم ٹرائینگل کا لباس پہن کر دائرہ میں داخل ہوسکتے ہیں—؟

ٹرائینگل میں سمتیں ہیں اور سمت رکاوٹ ہے۔ دائرہ میں بھی سمتیں موجود ہیں لیکن ان کا اول، آخر، ظاہر اور باطن ایک ہے اس وجہ سے سمتیں محسوس نہیں ہوتیں۔ سمتیں محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری اپنی سمت

ہمارے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ ہم ختم نہیں ہوتے — سمتیں محو ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن مقداروں پر ہمیں تخلیق کیا ہے وہ ایک زون سے دوسرے زون میں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ ہم یہاں رنگوں میں ہیں، اس سے پہلے زون ہیولیٰ کا ہے، ہیولیٰ سے قبل ہم روشنی میں ہیں اور روشنی — نور میں مقداروں کا پھیلاؤ ہے۔

جب ہم ٹرائینگل کی حدود سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہماری حدِ پرواز فصیل بن جاتی ہے۔

اس لمحہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے قدرت زمین کا خیال بھیجتی ہے۔ اور قانون یہ ہے کہ پرندہ دراصل وہاں موجود ہوتا ہے، جہاں اس کا خیال موجود ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہمارے پاس ٹرائینگل سے نکلنے کا راستہ ہے —؟

یہ سوال کسی ایک پرندہ کے نہیں، سب کے ذہنوں میں تھا اور لہروں کے ذریعے ایک پرندہ کا خیال دور بیٹھے ہوئے دوسرے پرندہ کو اور دوسرے کا خیال فضا میں محو پرواز تیسرے پرندہ تک پہنچ رہا تھا۔ اس طرح خیالات کی chain بن گئی جس نے سارے پرندوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ بالآخر سوالات بڑھتے گئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ پرندوں کی کانفرنس بلائی جائے جس میں مل بیٹھ کر قید و بند سے نکلنے کا راستہ تلاش کریں۔

پہاڑوں کے ساتھ وسیع و عریض رنگوں سے سجے میدان جس کے درمیان میں دراز گیسوؤں کی مانند بل کھاتا ہوا دریا بہتا تھا، پرندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ خبر دور دراز تک پھیلی۔ غول در غول پرندوں کے قافلے روانہ ہوئے کہ ہر ایک اس طلسم سے آزادی چاہتا تھا۔ کانفرنس شروع ہوئی.....

میزبان نے کہا، یہاں خوب سے خوب تر پرندہ موجود ہے اور سب کا حسن بے نظیر ہے۔ کیا اس خوب صورتی کی وجہ رنگ نہیں ہیں جس نے ہمیں ''دل فریب'' بنا کر ایک دوسرے سے الگ شناخت دی ہے؟ مگر پرندو! کیا تمہارے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ متفرق شناخت کے باوجود ہم یہاں ''ایک آواز'' پر جمع ہیں؟

کانفرنس کے جان دار اور حکمت سے بھرپور آغاز پر پرندوں کو ''چودہ طبق'' روشن ہوتے محسوس ہوئے اور کچھ

لمحہ کے لئے وہ سکتہ میں آ گئے کہ جب لباس الگ ہیں پھر اندر میں آواز ایک کیوں ہے؟

میزبان بولا، ہم سب نے اندر میں ''ایک آواز'' کو پڑھ لیا ہے اسی لئے جمع ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ الگ الگ لباس کا فرق ہے جس نے ہمیں الگ ہونے کے فریب میں مبتلا رکھا ہے اور دنیا کو ہمارے لئے ٹرائینگل بنا دیا ہے۔

انسانوں کی دنیا میں ایک ''عارف باللہ'' نے ہمارے لئے کہا ہے،

مٹی سے نکلتے ہیں پرندے اڑ کر　　دنیا کی فضا دیکھتے ہیں مڑ مڑ کر
مٹی کی کشش سے اب کہاں جائیں گے　　مٹی نے انہیں دیکھ لیا ہے مڑ کر

تشریح: ''پرندے جو اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ زمین سے بہت دور فضا میں پرواز کرتے ہوئے زمین کا نظارہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زمین سے بہت دور نکل آئے ہیں لیکن جس مٹی کی کشش سے ان کے بال و پر بندھے ہوئے ہیں، اس سے یہ کیسے آزاد ہو سکتے ہیں؟''

جسم ہلکا گلابی اور کناروں پر سفیدی سجائے سرخ و پیلے تاج والا پرندہ بولا، کانفرنس اور اس مقام پر جتنے رنگ موجود ہیں، سب مٹی کے روپ بہروپ ہیں مگر ایک رنگ ایسا ہے جس پر مٹی کا زور نہیں۔ وہ ہم سب میں ''ایک'' ہے اس لئے بے رنگ ہے۔ میں اندر میں آواز کی بات کر رہا ہوں جو مٹی کی قید سے آزاد ہے۔ پھر لباس کیا ہوا؟

طوطے سے اوپر ٹہنی پر براجمان حسین اور منفرد چونچ والے پرندہ نے کہا، لباس ہی قید ہے جس سے ہمیں آزاد ہونا ہے پھر رنگوں کا فرق مٹ جائے گا۔

رنگ مٹ گئے تو ہماری شناخت کیسے قائم رہے گی ــــ؟ سرخ نیلے طوطے نے بے ساختہ پوچھا۔

مور کے قریب مراقبہ میں بیٹھے پرندہ نے بات کئے بغیر دوستوں سے کہا، ہماری شناخت اگر رنگ ہوتے تو ہم فضا کے طلسم کو توڑتے ہوئے زمین کے کناروں سے نکل جاتے۔ لیکن دیکھو! یہاں سے باہر کی فضا ہمیں ان رنگوں کے ساتھ قبول نہیں کرتی۔ لہٰذا یہ رنگ ہماری شناخت نہیں ہیں۔

پھر کیا ہے ــــ؟ بیگم سرخ طوطے نے پوچھا۔

پیلے اور گہرے خاکی رنگ کی چڑیا بولی، ہماری شناخت وہ آواز ہے جس کی بنا پر ہم یہاں اکٹھے ہیں۔

تین طوطوں میں سے ایک نے بے تابی سے پوچھا، اس آواز کا کوئی لباس بھی ہوگا؟

خاموش الّو نے حکمت کے موتی بکھیرتے ہوئے کہا، ہاں! لباس ہے اور وہ لباس تم ہو، ہم ہیں، یہاں موجود سب لوگ ہیں۔ دریا، میدان اور ان پہاڑوں کو نظر انداز مت کرو، یہ بھی لباس کے روپ ہیں مگر سب کے اندر میں آواز ایک ہے۔ ان کو بھی لباس کی قید سے آزادی چاہئے۔ کچھ دیر کے لئے پرندے مراقبہ میں چلے گئے۔

پھر باز جو اِن میں اونچی اڑان رکھتا تھا، اس نے پوچھا، اتنی بلندی پر لے جا کر قدرت ہمیں واپس لانے کے لئے زمین کا خیال کیوں بھیجتی ہے؟ اور واپس ہی لانا ہے تو بلندی پر کیوں لے جاتی ہے؟

درخت پر پھڑ پھڑاتے ہوئے پیلے جسم اور نیلے سر والا پرندہ بولا، بتانے کے لئے کہ تمہاری بلندی دھوکا ہے۔ زمین کے کناروں سے نکلنے کے لئے سینکڑوں فٹ اوپر جانے کے بجائے اپنے اندر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

مور بولا، ٹھیک کہتے ہو، میں پرندہ ہوں لیکن پرواز بلند نہیں ہے۔ اس کا مطلب جسم کی پرواز دھوکا ہے۔

الّو کے قریب سفید وسلیٹی رنگ کے پرندہ نے کہا، کیا اس گفتگو کا کوئی نتیجہ ہے؟ آزاد دنیا ہمیں رنگوں کے ساتھ قبول کیوں نہیں کرتی؟ مرغ جیسی شکل والے سرخ پرندہ نے کہا، کیوں کہ آزاد دنیا فکشن رنگوں کی دنیا نہیں، بے رنگی کی دنیا ہے اور اس پر دائرہ محیط ہے۔

اور دائرہ کا رنگ کیا ہے—؟ لمبی ٹہنی پر بنے جھولے میں بیٹھے سبز اور پیلے رنگ کے پرندہ نے پوچھا، وہی جو اندر میں آواز کا ہے— سب میں ایک! نگاہیں تین طوطوں کے قریب براجمان پرندہ پر گئیں۔

یہ پرندوں کی دنیا کا پیغامبر ہدہد تھا۔ ہدہد نے کہا، تم جانتے ہو کہ میرے بزرگ یغفور* جو پیغمبر سلیمانؑ کے دربار کے اہم رکن تھے، ان کی حکمت ہماری وراثت میں شامل ہے۔ یہ زمین رنگوں کا طلسم ہے۔ اس طلسم پر دائرہ محیط ہے۔ رنگوں سے نکلنے کے لئے ہمیں ایسے رنگ میں داخل ہونا ہے جو بے رنگ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مراقب ہیں، کچھ آواز کے ذریعے اور کچھ بے آواز ہم سے بات کر رہے ہیں۔ جو لوگ مراقبہ میں ہیں، وہ اندر میں آواز کے ذریعے ہم سے ربط میں ہیں۔ کیا یہ اشارہ نہیں کہ ہم مٹی کے جسم کے بغیر بھی بات کرتے ہیں؟ لہٰذا ہم یہ جسم نہیں— ہم وہ ہیں جو اندر میں بول رہا ہے۔

طوطا بولا، آخر یہ کس کی آواز ہے—؟ ہدہد نے کہا، آواز اندر ہے تو جواب بھی اندر تلاش کرو۔

ایک چڑیا بے تابی سے اڑتی ہوئی آئی، کون ہے جو زمین و آسمان کے کناروں سے ہمیں لوٹا دیتا ہے؟

ہدہد مسکراتے ہوئے بولا، وہی جو اس کے کناروں سے نکلنے میں ہمیں مدد دیتا ہے۔ اگر تم نے بدلتے ہوئے رنگوں کو ثانوی حیثیت دے کر اندر میں آواز کا رنگ اپنا لیا تو قید و بند سے تحفظ اور آزادی نصیب ہو جائے گی۔

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

* کتاب ''محمد رسول اللہؐ جلد سوم'' میں حضرت سلیمانؑ کے دربار کے ہدہد کا نام یغفور لکھا ہے۔

سارہ خان

تان سین

تم نے سُر اور تال کا خیال رکھا، محو ہو کر گایا لیکن جو سکون اور لطف تمہارے استاد کی آواز میں ہے، تمہاری آواز میں نہیں۔ کیا بات ہے؟

چار سو سال پہلے کی بات ہے کہ گوالیار کے قریب گاؤں میں ایک دولت مند شاعر مکند مشرا اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ گھر میں ضرورت کی ہر شے میسر تھی لیکن اولاد نہ ہونے کی وجہ سے میاں بیوی اداس تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہاں بزرگ شیخ محمد غوث ہیں، ان کے پاس دعا کے لئے جاؤ۔ وہ دعا کی درخواست لے کر شیخ محمد غوث کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے دھاگے پر دم کر کے بازو پر باندھنے کا کہا اور دعا دی کہ اللہ تمہیں اولاد نرینہ سے نوازے۔ اللہ کی رحمت سے دعا قبول ہوئی۔ بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ماں باپ نے تان سین رکھا۔

تان سین پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا تو والد نے تعلیم کے لئے استاد مقرر کئے لیکن پڑھائی میں دل نہیں لگا۔ وہ قریب موجود جنگل میں جا کر جانوروں اور پرندوں کی آوازوں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک روز جنگل میں سے گائیک گزرے۔ تان سین جھاڑیوں میں چھپ گیا اور شیر کی طرح دھاڑا۔ تمام افراد ڈر گئے۔ وہ جھاڑیوں سے باہر آیا۔ وہ لوگ چونک گئے کہ شیر قریب میں موجود ہے، بچہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ بچہ نے بتایا کہ آپ لوگ ڈریں نہیں، شیر کی آواز میں نے نکالی تھی۔ یہ کہہ کر ایک بار پھر وہ شیر کی آواز میں دھاڑا۔ گائیکوں کے سربراہ نے دیکھا کہ بچہ نے شیر کی آواز نکالی ہے تو انہوں نے ڈانٹنے کے بجائے تعریف کی۔

سربراہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ موسیقی کے استاد تھے۔ تان سین کو شاگردی میں لینے کی خواہش ظاہر کی۔ باپ نے بچے کے بہتر مستقبل کے لئے اکلوتی اولاد کو استاد کی سرپرستی میں دے دیا۔ گائیکوں کا قافلہ تان سین کو ساتھ لے کر شہر کی حدود سے باہر نکل گیا۔

استاد نے تان سین کو پہلا سبق دیا۔

سا رے گا ما پا دھا نی سا

سا نی دھا پا ما گا رے سا

تان سین کو یہ سُر گا کر بہت لطف آیا اور سبق جلد

یاد کرلیا۔۔۔ دوسرا سبق ملا۔ آہستہ آہستہ موسیقی کے اسباق یاد ہوتے گئے۔ ساتھ میں تان پورا بجانا سیکھا، استاد نے مختلف راگ سکھائے اور بتایا کہ کس طرح راگ آدمی، حیوانات اور دوسری مخلوقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی راگ کو سن کر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور کسی سے آنکھیں پانی بن جاتی ہیں۔ کسی دھن کو سننے سے مایوسی طاری ہوتی ہے تو کسی سے امید کی دنیا روشن ہوجاتی ہے۔

قارئین! بعض گانوں کو سن کر لوگ اچھلتے کودتے ہیں کیوں کہ اس طرح کی موسیقی میں ہیجان ہوتا ہے۔ اور گانے ایسے بھی ہوتے ہیں جسے بندہ خاموشی سے سنتا ہے اور سکون محسوس کرتا ہے کیوں کہ ایسی موسیقی ترتیب دینے والے کے اندر ٹھہراؤ ہوتا ہے۔

ایک روز تان سین کے گھر سے پیغام آیا کہ والد کی طبیعت خراب ہے، بہت یاد کرتے ہیں۔ تان سین استاد سے اجازت لے کر گھر پہنچا۔ والد کی طبیعت دیکھ کر دل بھر آیا۔ آنکھیں فانی دنیا سے رخصت ہونے کے لئے بیٹے کی دید کی منتظر تھیں۔ بیٹے سے کہا، مجھے خوشی ہے کہ تم اچھے موسیقار بن گئے ہو۔ میں تمہیں آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔ اب شیخ محمد غوث کے پاس جاؤ اور تعلیم مکمل کرو۔ چند لمحوں بعد باپ نے آخری سانسیں لی اور اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اب گھر میں صرف والدہ تھیں، تان سین دیکھ بھال کے لئے ان کے پاس رک گیا۔ چند مہینوں بعد والدہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

تان سین کو والد کے آخری الفاظ یاد تھے کہ شیخ محمد غوث کے پاس جاکر تعلیم حاصل کرنی ہے۔

اصول کے مطابق جب ایک استاد تربیت کر رہا ہو تو دوسرا استاد شاگردی میں نہیں لیتا۔ تان سین نے موسیقی کے استاد کو والد کی خواہش سے آگاہ کیا۔

استاد نے فرمایا، بے شک اپنے والد کی خواہش پر عمل کرو لیکن تم میرے بھی بیٹے ہو، میرے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔

تان سین نے شیخ محمد غوث کے زیر سایہ تین سال تعلیم حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے تان سین کو گوالیار کے حکمران سے ملوایا۔ اب تان سین اکثر محل میں جاکر موسیقی کے جوہر دکھاتا تھا۔ شیخ محمد غوث کا انتقال ہوا تو وفات سے پہلے انہوں نے اپنی املاک تان سین کے نام کردیں۔

وقت گزرتا رہا، تان سین کو شاہی محلات میں گانے کے دعوت نامے ملتے رہے۔ تان سین کے سُروں اور دھنوں کی خبر مغل شہنشاہ اکبر تک پہنچی۔ اکبر نے اس کا گانا سنا تو بہت متاثر ہوا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کے محل میں آکر گایا کرے۔ اس طرح تان سین کی اکبر کے شاہی محل تک رسائی ہوئی۔

اکبر اس کے گانے سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا یعنی اپنے نورتنوں میں شامل

کرلیا۔رتن کے معنی ہیرے کے ہیں۔پوری مملکت میں صرف نورتن تھے جن میں ایک تان سین تھا۔بادشاہ نے اسے ''میاں'' کا خطاب بھی دیا۔میاں کے معنی معلم کے ہیں یعنی استاد جس کے پاس علم ہو۔

تان سین دربار میں گانے کے ساتھ اکبر کے لئے خصوصی گانا بھی گاتا تھا۔بادشاہ کو نیند نہیں آتی تھی تو کہتا تان سین کو حاضر کیا جائے۔تان سین ایسا راگ چھیڑ دیتا کہ اکبر کو نیند آجاتی اور صبح ایسا راگ سناتا تھا کہ اکبر آہستہ آہستہ نیند سے بیدار ہوجاتا۔یعنی تان سین کو اپنے فن میں اتنی مہارت ہوگئی کہ آواز سے ماحول تابع ہوجاتا تھا۔

مشہور ہے کہ جب تان سین گاتا تھا تو چرند پرند اس کے گرد جمع ہوجاتے۔بندہ کسی بھی کام میں خود کو جذب کرلے تو اس میں اثر پیدا ہوجاتا ہے اور ماحول میں موجود ہر فرد (پرندے، حشرات، جانور، پھول، پودے، درخت، پہاڑ، دیوار، آدمی وغیرہ) متاثر ہوتا ہے۔

لوگ کہنے لگے کہ ہزاروں سال میں ایسا کوئی ایک پیدا ہوتا ہے۔کوئی کہتا کہ تان سین ہیرا ہے ہیرا۔

مغل بادشاہ اکبر کہتا تھا،

''کیا خوب صورت آواز ہے۔اگر آواز کی خوش بو ہوتی تو تمہاری آواز کی مہک پھولوں کی خوش بو کی طرح ہوتی۔تم دنیا کے عظیم گائیک ہو۔جب بارش کا تذکرہ کرتے ہو تو آسمان بھی تمہیں سنتا ہے اور خوشی سے پانی برساتا ہے۔عظیم تان سین، اپنی آواز سے ہمیں تعظیم پیش کرو۔''

یہ سن کر تان سین خوش ہوتا اور گانا گاتا.....

بجُری چمکے برسے میگھا
مینہ ہر وا آئی بدریا
گرج گرج موہے ات ہی ڈراوے
گھن گرجے گھن دامنی چمکے
پپیہا پیہو پیہو تیر سناوے
کاہ کروں کت جاؤں
مورا جیا را ترسے
بجُری چمکے برسے میگھا

تان سین کی شہرت اور اکبر کا اس کی طرف جھکاؤ دربار میں کچھ لوگوں کو ناپسند تھا، وہ حسد کرنے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ اکبر تان سین سے ناراض ہوجائے۔ اکبر سے کہا کہ تان سین سے دیپک راگ سنا جائے، سنا ہے اس کو گانے سے چراغ جل اٹھتے ہیں۔

دیپک چھوٹا چراغ ہے۔دیپک راگ سب سے مشکل راگ مانا جاتا ہے جسے گانا ہر کسی کے لئے ممکن نہیں۔کہتے ہیں کہ جو اس راگ سے واقف تھا وہ بھی نہیں گاتا تھا۔جانتے ہیں کیوں—؟ نام کی طرح اس راگ کے گانے سے ماحول میں حدت اس حد تک بڑھ جاتی کہ دیئے جل اٹھتے تھے۔مسئلہ یہ بھی تھا کہ دیپک راگ کو گانے والا جان سے چلا جاتا۔

تان سین نے بادشاہ سے کہا، حضور جو اس راگ کو

گاتا ہے وہ خود جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ اکبر لاپروائی سے بولا، میاں تان سین ! تم اس سرزمین کے عظیم گائیک ہو۔ پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔

تان سین خاموش ہو گیا اور کچھ وقت لے کر دربار سے رخصت ہوا۔ اس نے سوچا ایسا کیا کیا جائے کہ دیپک راگ کے اثرات زیادہ نہ پھیلیں۔

خیال آیا کہ دیپک راگ سے آگ لگتی ہے تو میگھا راگ سے بارش ہوتی ہے، اگر ان دونوں کو ایک ساتھ گایا جائے تو بارش آگ کو بجھاتی رہے گی اور وہ جلنے سے بچ جائے گا۔ مسئلہ یہ تھا کہ دونوں راگ ایک ساتھ کیسے گائے جائیں—؟

تان سین کو موسیقی کے استاد کی ہونہار شاگرد روپا کا خیال آیا کہ وہ میگھا راگ گا سکتی ہے۔ اس نے جا کر استاد سے اجازت لی۔

شاہی دربار سلطنت کے عام اور خاص لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دیواروں میں دیئے رکھے گئے تھے۔ تان سین روپا کے ساتھ دربار میں موجود تھا اور تان پورا لئے اکبر کا منتظر تھا۔ اکبر نے تخت پر بیٹھتے ہی ہاتھ اٹھایا اور کہا، میاں تان سین! آواز کا جادو جگاؤ۔

تان سین نے حکم کی تعمیل کی اور الاپ شروع کیا۔ الاپ— راگ کے پہلے حصہ کو کہتے ہیں۔

تان سین کی آواز بلند ہوتی گئی، ماحول تبدیل ہونا شروع ہوا۔ ہوا آہستہ آہستہ گرم ہوئی۔ سننے والوں کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمایاں ہوئے، فوارہ میں موجود پانی ابلنے لگا، پرندے آشیانوں سے اڑ گئے، دیئے جل اٹھے، حدت نے آگ کی شکل اختیار کی تو لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔

تان سین کا جسم بھی گرم ہو گیا تھا لیکن وہ پسینے میں شرابور دیپک راگ گانے میں محو ہونے کی وجہ سے آس پاس سے بے خبر تھا۔ روپا کا بھی برا حال تھا مگر وہ اپنی تکلیف نظر انداز کر کے تان سین کے لئے پریشان تھی کہ کہیں جل نہ جائے۔ اس نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ میگھا راگ گانا شروع کیا۔ جیسے جیسے اس کی آواز کی گونج پھیلتی گئی، آسمان پر کالے سیاہ بادل جمع ہوئے اور تھوڑی دیر میں بارش برسنا شروع ہو گئی۔ دربار میں موجود لوگ کھلی فضا میں گئے کہ دیپک راگ سے جو گرمی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ختم ہو جائے۔

تان سین نے گانا ختم کیا۔ آنکھ کھولی اور آس پاس نگاہ دوڑائی تو چہرہ پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ روپا کو دیکھا اور سر کو جنبش دے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اس روز کے بعد تان سین کی شہرت آگ کی طرح دور دراز علاقوں میں پھیل گئی۔ روپا کو بھی خوب داد ملی۔ دیپک راگ گانے سے تان سین کے اندر شدید حدت پیدا ہو گئی تھی کہ طبیعت خراب ہو گئی اور دو مہینے تک وہ اکبر کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ صحت یاب ہونے کے بعد محنت و لگن سے کام شروع کیا۔ محل میں موسیقی کی تعلیم دیتا، دربار میں گاتا، شاعری بھی کی، اور نئے

راگ متعارف کرائے۔

ایک شام بادشاہ اکبر نے تان سین سے کہا، جب میں تمہیں سنتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ دنیا میں تم سے بہتر موسیقار موجود نہیں لیکن ابھی خیال آیا کہ تمہارا کوئی استاد ہوگا۔ تمہاری یہ شان ہے تو جس نے تمہیں سکھایا ہے وہ خود کیا ہوگا۔

تان سین مسکرادیا اور بولا، آپ نے درست فرمایا۔ مجھ جیسے بہت ہیں لیکن اس فن میں میرے استاد جیسا کوئی نہیں۔ لہجہ میں محبت اور احترام تھا۔

اکبر نے پوچھا، ان کا کیا نام ہے؟

سوامی ہری داس جی!

دربار میں لانے کے انتظامات کرو!

حضور! وہ یہاں حاضر نہیں ہوں گے۔ میرے استاد درباروں میں گانا پسند نہیں فرماتے۔

اکبر حیران ہوا اور بولا، وہ یہاں نہیں آئیں گے؟ ہم انہیں دگنی قیمت ادا کریں گے۔

تان سین نے کہا، بادشاہ سلامت! کچھ لوگوں کے لئے پیسوں سے زیادہ علم اور اصول کی اہمیت ہوتی ہے۔

اکبر نے کہا، پھر ہمیں وہاں لے چلو۔

تان سین نے عاجزی سے کہا، وہ دنیاوی چکا چوند سے بے نیاز ہیں۔ ہمارا ان کے پاس جانا انہیں اچھا نہیں لگے گا۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔

اکبر متاثر ہوا اور پوچھا، ملنے کا کوئی تو راستہ ہوگا؟

تان سین تھوڑی دیر خاموش رہا اور بولا، وہ صبح ہونے سے پہلے حمد وثنا کرتے ہیں۔ سننے کی یہی صورت ہے کہ ہم جھاڑیوں میں بیٹھ جائیں اور ان کے گانے کا انتظار کریں۔ اکبر راضی ہوگیا۔

استاد ہری داس شہری زندگی سے دور ہمالیہ کے پہاڑوں کے قریب رہتے تھے۔ کئی روز کا سفر کرکے یہ لوگ وہاں پہنچے۔ سورج نکلنے میں کچھ وقت تھا۔

استاد باہر آئے، دریا کنارے غسل کیا اور آلتی پالتی مار کر بڑی چٹان پر بیٹھ گئے۔ چڑیوں کی ہلکی ہلکی چہچہاہٹ سنائی دے رہی تھی کہ اتنے میں ایک مسحور کن آواز نے فضا کو لپیٹ میں لے لیا۔

پتّا پتّا، بوٹا بوٹا، چرند پرند، ہوا — لگتا تھا کہ سب ٹھہر کر خاموشی سے بے خودی میں آواز سن رہے ہیں۔ خود بادشاہ اکبر اور تان سین دم بخود تھے۔ یہ تان سین کے استاد کی آواز تھی جو آنکھیں بند کئے حمد وثنا کررہے تھے۔

اکبر نے بے ساختہ داد دی اور بعد میں استاد کی خوب تعریف کی۔ تان سین پھولے نہ سمایا۔

چند روز بعد اکبر نے تان سین سے کہا، تمہارے استاد نے جو کلام گایا، کیا تم وہ جانتے ہو؟

تان سین نے کہا، جی میں جانتا ہوں۔

اکبر نے سنانے کی فرمائش کی۔

تان سین نے کلام گایا لیکن اکبر پر وہ اثر طاری

نہیں ہوا جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں استاد کی آواز سے ہوا تھا۔ تان سین گانا گا کر خاموش ہوا تو اکبر نے کہا، تم نے سُر اور تال کا خیال رکھا، محو ہو کر گایا لیکن جو سکون اور لطف تمہارے استاد کی آواز میں ہے، تمہاری آواز میں نہیں۔ کیا بات ہے؟ تان سین نے جواب دیا،

''جناب، فرق ہے اور کیوں نہیں ہوگا — ؟ میں آپ کے لئے گاتا ہوں اور میرے استاد تمام جہانوں کے بادشاہ اللہ کے لئے گاتے ہیں!''

جواب سن کر اکبر لاجواب ہو گیا اور تان سین کے چہرہ پر خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

تان سین کے زمانہ میں موسیقی میں ایک نام بیجو باورا کا بھی لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ موسیقی میں تان سین سے کم نہیں تھا وجہ یہ تھی کہ بیجو باورا بھی تان سین کے استاد سوامی ہری داس کا شاگرد تھا۔

روایت کے مطابق جب بیجو چھوٹا تھا تو ایک روز والد کے ہمراہ فتح پور سیکری سے گزر ہوا۔ ساتھ میں والد کے موسیقی کے رفقا بھی تھے اور یہ گاتے بجاتے گزر رہے تھے۔ شہر میں سرِ عام گانے پر پابندی عائد تھی اور یہ پابندی تان سین نے عائد کی تھی۔

فتح پور کے محافظوں نے گانے سے روکا۔ وہ نہیں مانے تو جیل میں ڈال دیا۔ بعد میں نہ جانے کیا حالات پیش آئے کہ سوائے بیجو کے تمام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ بیجو باورا کم عمر تھا اس لئے چھوڑ دیا گیا۔

ناانصافی کے سبب بیجو انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ سوامی ہری داس کے پاس آیا، ان سے موسیقی سیکھی اور ساری عمر ان کے پاس گزاری۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ قتل کا بدلہ لے۔ وہ فتح پور سیکری آیا اور سرِ عام گانا گانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں پیشی کے دوران اس نے موسیقی میں تان سین پر برتری کا دعویٰ کیا۔ خبر اکبر کے دربار تک پہنچی۔

فیصلہ ہوا کہ بیجو باورا کا تان سین سے مقابلہ کروایا جائے اور ہارنے والے کی قیمت اس کی جان ہوگی۔

مقابلہ ہوا اور موسیقی میں اپنے زمانہ کا یکتا تان سین ہار گیا۔ سزا موت تھی اس لئے کہتے ہیں کہ تان سین نے بیجو سے جان بخشی کی درخواست کی۔ اکبر نے بیجو سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟

رحم دل بیجو باورا نے تان سین کو معاف کر دیا اور کہا، جناب! میں چاہتا ہوں کہ شہر میں سرِ عام گانا گانے پر عائد پابندی اٹھا لی جائے۔

ہندوستان کے علاقہ گوالیار میں میاں تان سین کا مقبرہ ہے۔ مقبرہ کے قریب املی کا درخت ہے۔ کہا جاتا ہے اس درخت کے پتّے کھانے اور مقبرہ کو ہاتھ لگانے سے گائیک اپنی آواز بہتر کر سکتا ہے۔

آج بھی کئی گلوکار تان سین کے طرز موسیقی کی مشق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تان سین اس دنیا سے دوسری دنیا میں چلا گیا ہے لیکن موسیقی زندہ ہے۔

نفیسہ شاکر

دو کشتیوں میں سوار مسافر

اگر زمین پر رہتے ہوئے زمین کے باسیوں کی توجہ زمین کے بجائے اس ہستی کی طرف ہو جائے جس نے تخلیق کیا ہے تو اندرون حرکت پُرسکون ہو جائے گی۔

آپ جانتے ہیں کہ دو مختلف منزل کے مسافر جب ساتھ سفر کرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے ــــ؟

مجنوں اونٹنی پر سوار لیلیٰ سے ملنے جا رہا تھا۔ سفر کے دوران لیلیٰ کے خیال میں گم ہوا اور بے خودی غالب آ گئی۔ مجنوں کے ہاتھ میں اونٹنی کی مہار تھی۔ گرفت ڈھیلی محسوس ہوئی تو اونٹنی نے آگے بڑھنے کے بجائے واپس مجنوں کے گھر کا رخ کیا۔ تصورِ جاناں میں گم مجنوں کو ہوش آیا اور جاننا چاہا کہ سفر کتنا باقی ہے تو حیران و پریشان ہو گیا کہ جہاں سے چلا تھا وہاں واپس آ گیا ہے۔

ایک بار پھر اونٹنی کا رخ لیلیٰ کے گھر کی جانب کیا۔

سفر آدھا طے ہونے کے بعد اونٹنی نے مہار کی گرفت ڈھیلی محسوس کی۔ وہ سمجھ گئی کہ مجنوں غافل ہو گیا ہے۔ پیچھے مڑی اور قدم مجنوں کے گھر کی طرف بڑھا دیئے۔ مجنوں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ اونٹنی میلوں پیچھے واپس آ گئی ہے۔ اس کی بے چینی عروج پر تھی۔ ایک بار پھر اونٹنی کو لیلیٰ کے گھر کی جانب چلنے پر مجبور کیا۔

متعدد بار راستہ میں یہی ہوا کہ مجنوں پر تھوڑی دیر میں لیلیٰ کا خیال غالب آ جاتا اور بے خودی طاری ہوتے ہی اونٹنی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے مڑ جاتی۔

عشق سے بے حال مجنوں نے سوچا آخر بات کیا ہے۔ میں آگے بڑھتا ہوں اور اونٹنی موقع ملتے ہی واپسی کا رخ کرتی ہے۔ ذہن پر زور دیا تو وجہ سامنے آئی کہ میں اپنے محبوب کے پاس جانا چاہتا ہوں اور اونٹنی کا دل اپنے محبوب میں ہے۔ اس کا رخ اپنے مطلوب اور میرا اپنے محبوب کی طرف ہے۔

قارئین! گھر پر اونٹنی کا بچہ رہ گیا تھا جس کی محبت ماں کو بے چین کئے ہوئے تھی۔ مجنوں چاہتا تھا کہ آگے بڑھے اور لیلیٰ کا دیدار ہو۔ اونٹنی گھر واپس جانا چاہتی تھی کہ اپنے بچہ کے پاس پہنچے۔

عشق کی شدت سے بے حال مجنوں نے سوچا کہ میری لیلیٰ آگے ہے جب کہ بچہ کی یاد اونٹنی کو آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ اس کی محبت مجھے منزل پر پہنچنے نہیں

دے گی اور میری چاہ اونٹنی کے لئے خرابی ہے۔اونٹنی کا مطلوب بچہ ہے اور مجھے لیلیٰ چاہئے۔ایسے میں اونٹنی کے ساتھ لیلیٰ تک پہنچنا ممکن نہیں۔پس طے ہوا کہ دو متضاد سمتوں کے عاشقوں کا سفر ایک ساتھ طے نہیں ہوسکتا۔اور وہ اونٹنی پر سے کود گیا۔

بظاہر اس حکایت کا موضوع لیلیٰ مجنوں، اونٹنی اور اس کا بچہ ہے لیکن درحقیقت یہ ان مسافروں کا حال بیان کرتی ہے جو دو کشتیوں میں سوار ہیں۔

کائنات سفر ہے اور دنیا مسافر خانہ ہے۔جو آتا ہے اسے ایک روز یہاں سے جانا ہے۔سفر کے دوران مسافر کسی مقام پر دل لگالے اور وہاں کے وسائل و اسباب کو اپنی ملکیت سمجھے تو راستہ کھوٹا اور منزل کا نشان — بے نشان ہوجاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ نے کراچی سے سفر کا آغاز کیا اور مختلف مقامات سے گزر کر اپنے اوپر عائد ذمہ داریاں پوری کرکے واپس کراچی آنا ہے۔

سفر کی ابتدا ہوئی۔کراچی سے آپ لاہور پہنچے، یہاں دل لگا اور دل لگی میں بھول گئے کہ کراچی میں کوئی میرا منتظر ہے، لاہور کو سب کچھ سمجھ لیا۔ذہن سے محو ہوگیا کہ مجھے لاہور کے بعد مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے پشاور جانا ہے اور پشاور سے واپس کراچی آنا ہے۔

لاہور میں قیام کے وسائل ختم ہوتے ہیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے نکلنا پڑتا ہے۔بے سروسامانی میں پشاور پہنچتے ہیں۔چوں کہ سفر کا مقصد یاد نہیں رہا اس لئے لاہور کا عکس پشاور میں قیام کی تصویر بن جاتا ہے۔اب بندہ اپنی فلم دیکھتا ہے اور کڑھتا ہے کہ یہ میں نے کیا کیا۔بندہ جہاں سے آیا ہے، وہاں ضرور پہنچے گا لیکن جس مقصد کے لئے سفر کیا تھا، وہ پورا نہیں ہوا۔

ایک طرف مقصد اور دوسری طرف خواہش — مقصد اور خواہش ایک نہ ہوں تو اونٹنی اور مجنوں کی طرح راستہ طے کرنے کے باوجود طے نہیں ہوتا۔

مثال کم زور ہے لیکن اس پر غور کرکے ہم دنیا میں اپنے سفر کی فلم دیکھ سکتے ہیں۔

یاد نہیں ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور دانستہ بھولنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں جانا کہاں ہے۔فانی دنیا کے رنگوں سے جسم کی تسکین ہوتی ہے اور تسکین کو راحت سمجھ کر ہم غفلت کی نیند سوجاتے ہیں۔جاگتے ہیں تو دنیا میں قیام کا آخری وقت ہوتا ہے۔دو کشتیوں میں سوار رہ کر کیا کھویا اور کیا پایا؟

مولانا رومؒ فرماتے ہیں،

جان زہجر عرش اندر فاقہ ای
تن ز عشقِ خار بن جو ناقہ ای

جان صاحبِ عرش کی جدائی میں فاقہ زدہ ہے اور جسم اسبابِ عیش کی جستجو میں اونٹنی کی مانند مخالف سمت کو جاتا ہے۔جان کی پرواز عالمِ بالا کی جانب ہے اور جسم کو زمین پسند ہے۔دل جب تک دنیا کی محبت سے

آزاد نہیں ہوتا، عالم بالا تک رسائی ممکن نہیں۔فرد کو ناقہ یعنی مٹی کی دنیا سے آزاد ہونا پڑے گا۔

مٹی مقداروں کا مجموعہ ہے اور ہر مقدار رنگ ہے۔ رنگ کی خصوصیت تغیر ہے اور تغیر کے معنی اصل سے دور ہونا ہے۔خالق و مالک کا ارشاد ہے،

''اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف جھک کر رہ گیا اور خواہشِ نفس کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتّے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو تاکہ یہ غور و فکر کریں۔'' (الاعراف: ۱۷۶)

مٹی کی دنیا میں دل لگنے کی وجہ وہ میڈیم ہے جو زمین پر فرد کا لباس ہے۔ یہ دل چسپی ہماری نہیں، ہمارے لباس کی زمین سے ہے۔ ہم کوئی اور ہیں۔ ہماری اصل لباس میں موجود حرکت سے منسلک ہے لیکن ہم نے حرکت کے بجائے خود کو لباس کے تابع کر دیا ہے۔مٹی — مٹی کو کھینچ رہی ہے لیکن اس مٹی میں موجود وجود کا تعلق اس عالم سے نہیں ہے، وہ روشنی سے بنا ہے اور روشنی کے عالم میں جانا چاہتا ہے۔

حرکت زمین کی طرف ہماری توجہ دیکھ کر بے چین رہتی ہے۔ اسے نزول کے بعد صعود کرنا ہے، جہاں سے آئی ہے وہاں جانا ہے۔ اگرچہ حرکت اپنا دائرہ پورا کرتی رہتی ہے لیکن ہماری وجہ سے زمین کی طرف آتے ہوئے یعنی نزول کرتے ہوئے حرکت کو فراق سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر زمین پر رہتے ہوئے زمین کے باسیوں کی توجہ زمین کے بجائے اس ہستی کی طرف ہوجائے جس نے تخلیق کیا ہے تو اندرون حرکت پُرسکون ہوجائے گی کیوں کہ خالق صرف آسمانوں میں نہیں ہے، وہ ہر سمت اور ہر شے پر محیط ہے۔توجہ نہ ہونے کی وجہ سے دوری پیدا ہوتی ہے۔

مجنوں کی کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔اس نے پاؤں باندھ کر کہا کہ اب میں گیند بن جاتا ہوں اور لیلیٰ کی کششِ عشق کے چوگان سے لڑھکتا ہوا چلوں گا۔یعنی میرا سفر اب لیلیٰ کے عشق کے دم پر ہوگا اور اس کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچے گی۔ چوگان اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے گیند کھیلتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ لیلیٰ سے محبت مجازی ہے کیوں کہ اس کا لباس مٹی سے بنا ہے۔ جب جان جسم سے جدا ہوگی — لیلیٰ کے خدوخال مٹی میں مل جائیں گے۔عشقِ مجازی میں مجنوں کی تڑپ اور ہمت کا یہ عالم ہے تو ہم جو دل میں اللہ کی محبت رکھتے ہیں، وہ مجنوں کی محبت سے کم کیسے ہوسکتی ہے — ؟ ہم جانتے ہیں کہ مجنوں کی محبت عارضی ہے اور دنیا فنا ہونے کے ساتھ فنا

ہوجائے گی لیکن اللہ کی محبت باقی رہتی ہے۔اس لئے اللہ کی محبت میں گیند بن جانا زیادہ اولیٰ ہے۔

گیند سے مراد ایسی شے جو محتاج اور حرکت کی پابند ہے۔گیند بظاہر طولانی گردش کرتی ہے مگر اس پر محوری گردش غالب ہوتی ہے — گیند دائرہ محیط ہونے کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے۔لہٰذا مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ یہ سفر اللہ کی محبت میں خود کو کھونے سے طے ہوتا ہے۔

زندگی کے دو رخ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نوع آدم کو دونوں رخوں سے متعارف کرایا ہے۔

''اس نے انسان کی تخلیق گارے سے کی۔پھر اس کی نسل ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔پھر اس کو درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور اس نے تمہیں سماعت دی، بصارت دی اور سوچنے والے دل دیئے۔تم لوگ کم شکر گزار ہوتے ہو۔'' (السجدۃ:۷۔۹)

خالق کائنات نے ہمارے لباس کی تخلیق گارے سے کی ہے۔گارے میں چپک ہوتی ہے، سڑاند ہوتی ہے۔پھر ہماری نسل حقیر پانی سے بڑھائی۔سڑاند — سڑاند کو بڑھاتی ہے۔یہ لباس کی تعریف ہے جسے ہم فخر سے پہنتے ہیں اور اس پر نازاں ہوتے ہیں۔

آیت میں زندگی کے دوسرے رخ ''روح'' کا ذکر ہے جس کے سبب انسان کو سماعت، بصارت اور فُواد عطا کیا گیا ہے۔یہ تینوں بنیادی صفات ہیں جن پر زندگی گزرتی ہے۔ہم روح کی سماعت سے سنتے ہیں، روح کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور روح کے فُواد سے سوچتے ہیں مگر لاعلمی یہ ہے کہ لباس کو حرکت کرتا ہوا دیکھ کر ان حرکات کو لباس سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

ہم روح اور جسم، دو کشتیوں کے سوار ہیں۔روح جسم کے ذریعے خود کو ظاہر کرتی ہے۔فرد جسم کو دیکھتا ہے، حرکت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا لہٰذا دھوکے میں آجاتا ہے البتہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ حرکت کے لاشمار لباس ہیں مگر تحریک دینے والا ایک ہے۔

دنیا کی رنگینیوں میں گم آدمی پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ خود کو تہی داماں محسوس کرتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ منزل کی طرف گامزن ہے لیکن ہوش آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مسافت نظر کا دھوکا ہے۔غبار تھمنے پر احساس ہوتا ہے کہ وہ وہیں کھڑا ہے اور جسے آگے بڑھنا سمجھا، دراصل اس کا تکون میں سفر ہے۔

محترم قارئین! کائنات میں سفر کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب قدم اللہ کی جانب اٹھتے ہیں۔اس کے علاوہ ہر حرکت — جمود ہے۔جسم کی غذا کا اہتمام کرنے والا روح کی تکمیل سے غافل ہے۔روح جزو ہے اور جزو، کُل میں جذب ہونے کے لئے بے چین ہے۔

کتابِ مبین میں ارشاد باری ہے،

''خبردار رہو! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔'' (الرعد:۲۸)

اللہ کے علاوہ کسی بھی شے کا ذکر بے سکونی ہے۔ اللہ سے محبت کا مطلب دنیا ترک کرنا نہیں ہے۔ ترکِ دنیا کفرانِ نعمت ہے۔ آسمانی کتابوں اور آخری الہامی کتاب قرآن کریم میں اخلاق حسنہ اور خدمت خلق کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سب بندہ پر بندوں کے حقوق ہیں۔ اللہ کے حقوق یہ ہیں کہ اللہ کا ذکر اور کائنات میں تفکر کیا جائے۔ بندہ کبھی بھی اللہ کا حق ادا نہیں کرسکتا البتہ وہ اس راہ پر قائم ہوجاتا ہے جسے صراط مستقیم کہتے ہیں۔ مومن دین و دنیا کی فراست رکھتا ہے۔ تمام دنیاوی تقاضے پورے کرتا ہے لیکن ان تقاضوں سے مغلوب نہیں ہوتا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں،

''ایک روز حوض کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ کوزہ میں نظر جو پڑی تو اپنے منظورِ نظر محبوب کو دیکھا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ پس پہلے محبوب اختیار کر پھر اس پر جان قربان کردے۔ اور یہ وثوق سے کہہ کہ اگر جان اس کی راہ میں قربان ہوجائے تو یہی بہتر ہے۔ پھر اللہ کی صفت کو دیکھ۔ تو اپنی شمع کا پروانہ بن جا اور اس پہلو پر نظر نہ کر کہ تیری جان کو غم لگ جائے گا۔ جو ہوتا ہے ہونے دے، اس کا ہونا ہی بہتر ہے۔''

(کتاب: کشف الاسرار)

کشتی سمندر میں ہوتے ہوئے بھی سمندر کے پانی کو کشتی میں نہیں آنے دیتی۔ اگر پانی کشتی میں داخل ہو جائے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ دنیا کی مثال پانی اور کشتی آدمی کی مانند ہے۔ جس طرح کشتی پانی میں رہتے ہوئے پانی سے جدا ہے اسی طرح بندہ دنیا میں رہ کر دنیا کو اپنے اندر اترنے نہ دے۔

حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں،

خسرو دریا پریم کا الٹی وا کی دھار

جو ابھرا سو ڈوب گیا جو ڈوبا سو پار

جو ابھرا سو ڈوب گیا — ابھرنے سے فرد کی اسپیس نمایاں ہوتی ہے اور اسپیس دوری ہے۔

جو ڈوبا سو پار — اپنی شناخت کو مغلوب کرنے والا اس راہ میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

فرد کی اسپیس یا شناخت کیسے مغلوب ہو — ؟

طریقہ یہ ہے کہ ہر کام اللہ کی رضا اور معرفت کے لئے کیا جائے تاکہ نسبتِ عشق حاصل ہو۔

''جب قلب انسانی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسان کا ہجوم ہوتا ہے اور انسان قدرت کے عطیات میں فکر کرتا ہے، اس وقت نور اللہ کے تمثلات بار بار طبیعت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں۔ یہاں سے اس ربط یا نسبتِ عشق کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس نسبت کے باطنی انہماک کی کیفیتیں رونما ہونے لگتی ہیں۔ پھر ان لطیفوں یا روشنی کے دائروں پر جو انسانی روحوں کو گھیرے ہوئے ہیں روشنی کا رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ یعنی ان دائروں میں انوارِ الٰہیہ پے در پے پیوست ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح نسبتِ عشق کی جڑیں مستحکم ہوجاتی ہیں۔'' (لوح وقلم)

عقل مند چیتا

قارئین! لیفٹیننٹ کرنل اے لاک نے طویل عرصہ ملائیشیا کے جنگلات سے قریب علاقوں میں بحیثیت ضلعی افسر متعدد قابل ذکر مہمات سرانجام دیں۔ بعد میں ان مہمات کو کتاب کی صورت میں قلم بند کیا۔ زیرنظر مضمون ان کی ایک تحریر کا اردو ترجمہ ہے۔

میری زندگی شکار میں گزری ہے۔ اس دوران عجیب وغریب واقعات اور تجربات پیش آئے۔ کیا کچھ نہیں دیکھا— مشاہدات کو کسی حد تک بیان کرنے کی کوشش ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنگل کی خاموشی میں خوف و دہشت اور ایسے میں کسی درندہ کا سامنا ہوجائے تو کیفیت کیا ہوتی ہے، قاری ان واقعات کو پڑھنے کے باوجود محسوس نہیں کرسکتا۔

گھنے جنگلات میں وقت گزرے اور خوں خوار چیتے سے سامنا نہ ہو، کیسے ممکن ہے۔ زندگی میں کئی چیتوں سے سامنا ہوا ہے اور شکار بھی کیا ہے لیکن اتنا ہیبت ناک چیتا پہلے نہیں دیکھا۔ اس کی جسامت اور قد عام چیتوں سے بڑا تھا۔ انگاروں جیسی سرخ آنکھوں میں ایسی دہشت کہ سورما کانپ اٹھیں۔ اس خطہ کے تمام چیتوں سے زیادہ طاقت وراور مکار!

یہ قصہ ملائشیا کے علاقہ ڈنگن میں دریائے ڈنگن کے کنارے آباد ایک چھوٹے گاؤں جرنگاؤ کا ہے جس کے مکین آدم خور چیتے کا شکار بن گئے۔

آگے پڑھنے سے پہلے علاقہ کے جغرافیہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ جرنگاؤ سے تین میل کے فاصلہ پر کمپونگ واؤ ہے۔ کمپونگ مالے زبان میں گاؤں کو کہتے ہیں۔ واؤ سے مزید تین میل آگے کمپونگ مانچس ہے۔ یہ تینوں گاؤں دریا کنارے قطار میں آباد ہیں۔

ڈنگن سے جرنگاؤ پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ پہلا راستہ دریا ہے۔ اگر موٹر بوٹ اچھی ہے تو سفر ساڑھے تین گھنٹے میں گزر جاتا ہے۔ دوسرا راستہ ریلوے لائن ہے جو دوسرے کنارے پر دریا کے ساتھ ساتھ گزرتی ہے۔ ریل کا سفر کرکے بھی جرنگاؤ کے لئے موٹر بوٹ لینا پڑتی ہے۔ اور تیسرا راستہ جنگل ہے۔

دریا کے دونوں اطراف ربڑ کے جنگلات ہیں۔ یہاں رہنے والوں کی معاش کا بنیادی ذریعہ ربڑ کے درخت اور دوسرے نمبر پر لوہے کی کانیں تھیں۔ ریلوے

لائن جنگل سے بھی گزرتی تھی جس کے ذریعے لوہا ضلع ڈنگن پہنچایا جاتا تھا۔اس علاقہ میں ریلوے لائن کی آخری حد پر گاؤں پڈنگ پلٹ ہے جس کے بالکل سامنے دریا کے دوسری طرف گاؤں مانچس ہے۔ مانچس سے جرنگاؤ کا فاصلہ چھ میل ہے۔چوں کہ یہ دونوں دریا کے ایک کنارے پر آباد ہیں اس لئے فاصلہ طے کرنے کے لئے پہلا راستہ دریا اور دوسرا جنگل ہے۔

1950ء میں یہاں آدم خور چیتا داخل ہوا جس سے خوف و ہراس پھیل گیا۔کئی لوگ اور متعدد مویشی جان سے گئے۔

میرا قیام ضلع ڈنگن سے تین گھنٹے کے فاصلہ پر ضلع کمامن میں تھا۔جب آدم خور کے ہاتھوں پہلا کان کن ہلاک ہوا تو خبر مجھ تک نہیں پہنچی۔

کئی روز بعد اطلاع ملی کہ بدقسمت کان کن جنگل سے گزر رہا تھا، چلتے ہوئے ساتھیوں سے آگے نکل گیا۔ پیچھے رہ جانے والوں نے چیخیں سنیں۔وہ بوکھلا گئے اور تیزی سے آگے بڑھے کہ یکا یک ان کے قدم رک گئے۔ساتھی کی آواز کے بعد ربڑ کا جنگل چیتے کی دھاڑ سے گونج اٹھا۔وہ جہاں سے آرہے تھے، تیزی سے اس جانب دوڑ لگادی، آگے جانے کی ہمت نہیں کی۔

اگلے روز وہ بے چینی سے ساتھی کان کن کے منتظر تھے اور دعا کر رہے تھے کہ وہ چیتے کے شکنجہ سے نکل گیا ہو۔جب وہ نہیں آیا تو یقین ہوگیا کہ درندہ کا لقمہ بن گیا ہے۔خبر آس پاس پھیل چکی تھی۔فیصلہ کیا گیا کہ پندرہ سے بیس آدمی جنگل سے گزریں اور دوست کان کن کی لاش تلاش کریں۔اگرچہ کسی نے چیتے کو نہیں دیکھا تھا لیکن دھاڑ نے ہیبت طاری کردی تھی۔یہ اس علاقہ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔

بالآخر دریا کے کنارے جھاڑیوں کے درمیان اسی بدنصیب کان کن کا لباس ملا— قریب جسم کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔وہ چند لمحوں کے لئے سانس لینا بھول گئے۔درندہ نے ان کے ساتھی کا آدھے سے زیادہ جسم ہڑپ کرلیا تھا۔لاش کے بچے کچے ٹکڑے گاؤں لائے اور آخری رسومات ادا کر کے دفنا دیا گیا۔

صبح لوگ جاگے تو شور مچ گیا۔آدم خور کے پنجوں کے نشانات گاؤں کے اندر موجود تھے۔اور یہ دیکھ کر ان کی جان میں جان نہ رہی کہ جس راستہ سے یہ لوگ ساتھی کان کن کے جسم کی باقیات لے کر آئے تھے، چیتا اس راستہ پر ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔چیتے نے تعاقب کیوں کیا— ؟

دوسرے واقعہ کی اطلاع بھی مجھے تاخیر سے ملی۔ اگر پہلے مل جاتی تو بھی میں چھ گھنٹے سے پہلے جرنگاؤ نہیں پہنچ سکتا تھا۔اس میں آپ وہ وقت شامل کرلیں جب جرنگاؤ سے پڈنگ پلٹ پہنچنے کے لئے چھ میل کا سفر کر کے فون پر ڈنگن کی انتظامیہ کو اطلاع دی گئی، اس کے بعد خبر کمامن پہنچتی۔

یہ دوسرا شخص 12 جولائی 1950ء کو ہلاک ہوا۔ خبر ملنے کے بعد میں جرنگاؤ کے لئے نکل چکا تھا۔ مقامی افراد کا کہنا تھا کہ اس کے جسم کو دو چیتوں نے کھایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کم لوگ اس بات سے واقف تھے کہ چیتے کے اگلے پنجے پچھلے پنجوں سے بڑے ہوتے ہیں لہٰذا وہ مغالطہ میں رہے۔

یہ شخص رشتہ داروں سے ملنے واؤ سے جرنگاؤ جا رہا تھا۔ گھر واپس نہ لوٹنے پر پہلے دن کسی کو فکر نہیں ہوئی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ وہ جرنگاؤ میں ٹھہر گیا ہے۔ رشتہ دار سمجھ رہے تھے کہ اب تک وہ گھر پہنچ گیا ہوگا۔ تیسرے دن گھر والے پریشان ہوئے کیوں کہ جرنگاؤ سے آنے والے ایک شخص نے بتایا کہ وہ وہاں سے اسی روز گھر کے لئے نکل گیا تھا۔

گاؤں کے لوگ تلاش میں نکلے۔ انہیں دریا کنارے اس کی چُھری ملی۔ قدموں کا تعاقب کیا تو 200 گز کے فاصلہ پر خون میں لت پت لباس ملا۔ اس سے مزید 400 گز کے فاصلہ پر انہیں جسم کی باقیات ملیں۔ اس رات آدم خور چیتا ان لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے کیمپونگ واؤ پہنچا، دیکھنے کے لئے کہ یہ اس کے شکار کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ میرے نزدیک آدم خور چیتوں کی یہ عادت سب سے زیادہ دہشت طاری کر دینے والی ہے۔

جرنگاؤ کے نمبردار نے جو تفصیلات مجھے دیں، اس سے واضح ہوتا تھا کہ چیتے نے اچانک حملہ نہیں کیا بلکہ باقاعدہ اس کا پیچھا کیا اور پھر مارا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ اپنے لوگوں سے کہو کہ اکیلے سفر سے گریز کریں اور گروہ کی صورت میں نکلیں جس میں تین سے کم لوگ نہ ہوں۔ اس نصیحت پر پہلے عمل کیا گیا، بعد میں نظرانداز کر دیا گیا۔

27 جنوری 1951ء کو ربڑ کے جنگلات میں کام کرنے والے مزدور کو چیتے نے کھالیا۔ لاش برآمد ہوئی تو چیتے نے صرف ایک پیر کھایا تھا۔ یہ خبر بھی مجھے دیر سے ملی، میں کچھ نہیں کر سکا۔

1 فروری 1951ء کی بات ہے، میں دریائے ڈنگن سے واپس جرنگاؤ کی طرف آ رہا تھا کہ میں نے کیمپونگ واؤ کے قریب لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ ابتدا میں سوچا کہ جمعہ ہے لوگ نماز پڑھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد کسی خیال کے تحت میں نے کشتی ایک جگہ رکوادی۔ اگر میں پہلے خیال پر کشتی روک دیتا تو مجھے گاؤں والوں کے ساتھ چیتے کے تعاقب کا موقع مل جاتا۔ وہ لوگ تدفین کے لئے لاش لے کر آنے والے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اس دن اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس چیتے کو ہلاک کرنا ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ لاش کو جائے حادثہ سے اٹھانے سے پہلے میں وہاں پہنچوں۔ ضلعی انتظامیہ کی جانب سے باقاعدہ طور پر گاؤں کے نمبرداروں کو اطلاع بھجوائی گئی کہ وہ کسی بھی حادثہ سے

فوری مطلع کریں۔

ایک مہینہ تک آدم خور کی طرف سے خاموشی رہی۔

میرے یہاں آنے سے امید بندھی کہ اب آدم خور چیتے سے نجات مل جائے گی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ شکاری بہت شاطر اور چالاک ہے۔ باقاعدہ منصوبہ بندی سے حملہ کرتا ہے اور کسی کو اپنے مقام کی خبر نہیں ہونے دیتا۔ چیتے کو ہلاک کرنا میرے لئے معمولی چیلنج نہیں تھا۔ مدد کے لئے ڈنگن انتظامیہ کی طرف سے پولیس کے چند سپاہی ساتھ تھے۔

7 مارچ 1951ء کو چیتے نے پانچواں شکار کیا۔ یہ بھی ربڑ کے درختوں پر کام کرنے والا شخص تھا۔ میں ڈنگن میں ہی تھا جب خبر ملی اور فوری موٹر بوٹ کے ذریعے جرنگاؤ روانہ ہوا اس امید کے ساتھ کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے لاش نہیں اٹھائی گئی ہوگی۔ آدھا راستہ طے کیا تھا کہ ہمیں چھوٹی کشتی آتی ہوئی نظر آئی جس میں اس کی ڈیڈ باڈی تھی۔ کشتی میں موجود لوگوں سے کہا کہ مجھے اس کے کپڑے دے دو۔ میں ذہن میں منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔

میں نے دیکھا تھا کہ چیتے کے مارنے کا طریقہ ایک تھا۔ وہ شکار کے سر اور کندھوں پر جھپٹتا اور دانت گردن میں گاڑ دیتا تھا۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اس کا سامنے کا نچلا دانت ٹوٹا ہوا یا غائب تھا۔

لوگوں سے معلومات لیتے ہوئے میں نے سوچا کہ کہ چیتے تک پہنچنے کے میرے امکانات کم ہیں کیوں کہ کم از کم ساٹھ لوگ لاش کی تلاش میں نکلے تھے۔ اس مرحلہ پر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آدم خور نر ہے یا مادہ یا پھر وہ چیتا نہیں، دوسرا درندہ ہے۔ میں اس کے پنجوں کا معائنہ کر کے بہت کچھ جان سکتا تھا۔

ان لوگوں سے کہا کہ پہلے مجھے بتاؤ کہ چیتے نے حملہ کس مقام پر کیا تھا۔ پنجوں کے نشانات کا تعاقب کیا تو ہم گھنے جنگلوں میں نکل گئے۔ میں نے اندازہ لگانا شروع کیا کہ وہ آیا کہاں سے ہوگا۔ اس مرحلہ پر مجھے بہت صبر اور تحمل سے گزرنا پڑا کیوں کہ اتنے سارے لوگوں میں کوئی کہتا وہ اس طرف گیا ہے، تھوڑی دیر بعد دوسرا آواز لگاتا کہ چیتا اس طرف گیا ہے۔

آخر کار میری تلاش رنگ لائی اور میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ چیتا جب کسی آدمی کی آواز سنتا تو وہ جنگل میں اس مقام سے داخل ہوتا تھا جہاں سے ربڑ کے درخت شروع ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بلی کی طرح شکار کا تعاقب کرتا۔ بلی جب شکار کرتی ہے تو جھک جاتی ہے، آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ کمر اندر کی طرف اور پیٹ زمین سے قریب ہو جاتا ہے۔ آدمی جب ربڑ نکال لیتا اور درخت سے بندھی ہوئی تھیلی میں ربڑ جمع کرنے میں مشغول ہوتا تو چیتا جست لگانے

کے لئے تیار ہو جاتا۔ تھوڑی دیر انتظار کرتا کہ جیسے ہی آدمی درختوں سے تھیلی جمع کرتے ہوئے آخری درخت پر پہنچے، وہ اس پر حملہ کر دیتا تھا۔

چیتا اس طرح کے حالات میں شکار کے لئے سرپرائز اور اپنی تیز رفتاری پر انحصار کرتا ہے۔ حادثہ کے مقام پر میں نے نرم زمین پر پنجوں کے دو نقوش دیکھے۔ نقوش میں گہرائی بتا رہی تھی کہ چیتا یہ حالت اس وقت اختیار کرتا ہے جب بالکل شکار کرنے والا ہو۔ وہ اپنے اور شکار کے درمیان فاصلہ دو جست میں پھلانگ لیتا ہے۔

قریب موجود کام کرنے والے شخص نے ساتھی کی دردناک چیخ سنی، پھر چیتے کی غراہٹ سنی اور اس کے بعد خاموشی تھی۔ کسی کو آواز کی طرف جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تاہم اس معائنہ کے دوران جو شواہد مجھے بطور خاص مطلوب تھے وہ نہیں ملے۔

ایک مقام پر آگے جا کر چوڑی پگڈنڈی تھی جس پر کسی کو گھسیٹنے کے نشانات تھے۔ چیتا اسے گھسیٹتے ہوئے اس علاقہ کے آخری سرے پر لے گیا تھا اور وہاں سے مزید ایک کلومیٹر گھسیٹتا ہوا دلدلی علاقہ میں داخل ہوا۔ یہ تاریک جگہ تھی۔ دو فٹ کے قریب یہاں پانی تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے نگاہ پانچ گز سے زیادہ دور نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس مقام پر میری نظر سفید چیز پر پڑی جسے میں نے لکڑی کا ٹکڑا سمجھا۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے لکڑی کا سفید ٹکڑا بھی اٹھا لیا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ لکڑی نہیں، آدمی کی ہڈی ہے۔

یہ اشارہ تھا کہ آدم خور چیتے نے یہاں رک کر شکار کو کھایا ہے۔ وہ ہر شکار یہاں لاتا تھا۔ وہاں متعدد انسانی ہڈیاں ملیں۔ میں نے چیتے کے بیٹھنے کے نشانات دیکھے تو یقین ہو گیا کہ آدم خور نے اس جگہ کو اپنے لئے محفوظ سمجھ لیا ہے۔ شواہد دیکھ کر اندازہ ہوا کہ چیتا نر ہے اور اس کے پنجے غیر معمولی بڑے ہیں۔

اس مقام پر چیتے کو مارا نہیں جا سکتا۔

میں یہاں سے واپس ہوا اور ان لوگوں سے کہا کہ اس راستہ سے چلو جہاں سے تم لاش کو لے کر آئے تھے۔ مجھے ایسے درخت کی تلاش تھی جس پر میں بغیر کسی خطرہ کے چیتے کی نظروں سے محفوظ رہ کر رات میں اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ ربڑ کے درختوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ اس کے پتے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں دوسرے درخت موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان ہی میں سے کسی کا انتخاب کرنا تھا۔ میں ایسے درخت کے انتخاب پر مجبور ہوا جس کی شاخیں جھول رہی تھیں اور چیتے کو مارنے میں میرے نشانہ میں مزاحم ہو سکتی تھیں۔

میں نے گاؤں کے لوگوں کو واپس بھیجا اور اپنے ملازم پامٹ اور چند پولیس اہل کاروں کے ساتھ یہاں رک گیا۔ وقت ضائع کئے بغیر ایک ساتھی کے ساتھ درخت پر چڑھا اور دو مضبوط شاخوں کے درمیان تختہ باندھا

جس پر میں بیٹھ سکتا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے آرام بھی کرسکتا تھا۔ چیتے کی نظر سے محفوظ رہنے کے لئے تختہ کے اردگرد ٹہنیاں اور گھاس پھوس جمع کی اور اس طرح باندھیں کہ چیتا کیا، آدم زاد کو بھی خبر نہ ہوتی۔

پھر مزدور کے خون آلود کپڑے نکالے اور اندر گھاس پھوس بھر کر انسانی پتلا بنا دیا۔ فاصلہ سے دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرا ہوا آدمی ہے۔ چیتا یہاں سے کب گزرے گا میں نہیں جانتا تھا، بات ایک دن سے کئی دنوں تک جاسکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آدم خور نے اگر کسی مقامی کا پیچھا کیا تو وہ اس راستہ سے ضرور گزرے گا۔ جب وہ پتلے کو سونگھنے کے لئے رکے گا، مجھے گولی چلانے کا موقع مل جائے گا۔

سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے درخت پر نشست سنبھالی اور ساتھ موجود لوگوں کو واپس بھیج دیا۔ میں نے پولیس اہل کاروں سے کہا کہ شور مچاتے ہوئے جانا تا کہ اگر ہم چیتے کی سماعتی حدود میں ہوں تو وہ جان لے کہ ہم واپس جا چکے ہیں۔

میں نو بجے تک بے حرکت بیٹھا رہا کیوں کہ چیتا آس پاس چھپا ہوا ہو تو معمولی حرکت اسے میری خبر دے دیتی۔ چیتے کی طرف سے کوئی آہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ جنگل کی ہیبت بڑھ رہی تھی۔ اس خاموشی میں پہلی بار خشک پتّوں کے چرچرانے کی آواز سنی جو آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ میری توقع کے برعکس چیتا دلدل کی طرف سے نہیں بلکہ میری پشت کی طرف سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ بہت آہستہ اور محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس درخت کے نیچے سے گزرا جس پر میں تخت نشین تھا۔ تھوڑا آگے جا کر وہ رک گیا۔ میں سانس روک کر بیٹھا رہا۔ چند لمحوں بعد پتلے کے قریب کوئی کھڑا دکھائی دیا۔۔۔ اسے دشمن کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

مجھے شکار کا تجربہ ہے لیکن کبھی ضرورت سے زیادہ اعتماد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ محفوظ مقام پر ہونے اور کئی آدم خور چیتوں کو ہلاک کرنے کے باوجود مجھ پر کچھ وقت کے لئے اس آدم خور کا خوف طاری ہو گیا۔

میں نے ابھی تک واضح طور پر اسے نہیں دیکھا تھا۔ بس اندھیرے میں اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ پتلے کے سامنے کھڑے ہو کر چیتے کا گہری سوچ میں گم ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ دشمن بہت سمجھ دار، اعلیٰ منصوبہ ساز اور شاطر تھا۔ ممکن ہے کہ پتلے کو دیکھ کر چیتا بھی میرے بارے میں یہی سوچ رہا ہو۔

میری طرف سے ہلکی آہٹ اس کے فرار کا سبب بن جاتی۔ ایک دو منٹ تک سانس روکنے کے بعد بہت آہستہ سے سانس لینے لگا کہ خود اپنے سانس کی آواز سنائی نہ دے۔ دوبارہ نظر پڑی تو چیتا وہاں نہیں تھا بلکہ دبے پاؤں اس درخت کے قریب آرہا تھا، جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ (قسط:۱)

فرزانہ پرویز

تھوڑی روشنی اندھیرے پر غالب ہے

صلاحیت منتقل ہونے کے ساتھ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کیوں کہ صلاحیت اور ذمہ داری ایک دوسرے سے نسبت رکھتے ہیں۔ ذمہ داری کے ساتھ کام کرنا کسی بھی عمل اور تعلق کی حفاظت ہے۔

نیکی کرنا آسان ہے، اس کی حفاظت مشکل ہے۔

آپ کہیں گے کہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

حقیقت یہی ہے۔ دین میں کشادگی اور ہر چھوٹے بڑے عمل کی ''قدر'' ہے۔ راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا اور پیاسے کو پانی پلانا نیکی میں شمار ہوتا ہے اسی طرح اپنے بھائی دوستوں کو مسکرا کر دیکھنا صدقہ (نیکی) ہے۔

نیکی کی تعریف میں ارشاد ہے،

''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں اور اللہ کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، ضرورت مندوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں۔ اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔'' (البقرۃ:۱۷۷)

چھوٹے، بڑے، امیر اور غریب کا فرق کئے بغیر مدد کرنا اور سخت لہجہ کے جواب میں آواز نرم رکھنا نیکی ہے۔ حالاں کہ یہ سارے کام معاشرتی اعتبار سے بنیادی نوعیت کے ہیں مگر اکثر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ جب ہم بنیادی نوعیت کہتے ہیں تو اس سے مراد معاشرہ کی اساس قائم ہونا ہے جس کے بعد سماج میں تہذیب و تمدن اور ترقی کا آغاز ہوتا ہے۔ بے انصاف معاشرہ آگے نہیں بڑھتا۔ بھلائی کرنے کے بعد جتانے یا اس کا طعنہ دینے سے نیکی ضائع ہو جاتی ہے۔

رحیم و کریم اللہ فرماتے ہیں،

''ایک میٹھا بول اور ناگوار بات پر چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز اور بردبار ہے اس کی صفت ہے۔'' (البقرۃ: ۲۶۳)

اللہ تعالیٰ نے کائنات قواعد، قوانین اور ضابطوں پر بنائی ہے۔ تمام مخلوقات میں انسان کو ان قوانین کا علم سکھایا تاکہ وہ ان علوم کو سیکھ کر دیگر مخلوقات کو فائدہ

پہنچائے ۔ صلاحیت منتقل ہونے کے ساتھ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کیوں کہ صلاحیت اور ذمہ داری ایک دوسرے سے نسبت رکھتے ہیں ۔ ذمہ داری کے ساتھ کام کرنا کسی بھی عمل اور تعلق کی حفاظت ہے۔

دو رخوں میں قائم یہ کائنات ہر لمحہ پھل پھول رہی ہے اور اگلے لمحہ سمٹ جاتی ہے۔ سمٹنے کے بعد پھر پھیلتی ہے۔ زندگی اس نظام کی وجہ سے رواں دواں ہے۔

باطنی رخ میں کائنات حرکت ہے اور ظاہری رخ میں محض عکس ہے۔ حرکت سے ناواقفیت کی وجہ سے ساری اہمیت عکس کو دے دی جاتی ہے۔

مادہ (matter) کے تحت جو علوم اختراع کئے جاتے ہیں، ان میں مادہ زیر بحث آتا ہے۔ ہر بات مادہ سے شروع اور مادہ پر ختم ہوتی ہے۔ ان کے نتائج مستقل اور مستحکم نہیں ہوتے کیوں کہ مادہ کا انجام ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

آدم کو بنایا ہے لکیروں میں بند
آدم ہے اسی قید کے اندر خورسند
واضح رہے جس دم یہ لکیریں ٹوٹیں
روکے گی نہ اک دم اسے مٹی کی کمند

تحقیق کا دارومدار مادہ پر ہو تو نتائج کی حفاظت نہیں ہوتی۔ لوہا مضبوط اور سخت دھات ہے، اس کے ظاہری رخ کو تحقیق کی بنیاد بنائیں گے تو یہ حقیقت مسلّم ہے کہ لوہے کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ جس کو ہم ظاہر کہتے ہیں وہ پہچان کے لئے لباس ہے اور لباس کتنا مضبوط کیوں نہ ہو، پائیدار نہیں ہوتا۔

کائنات کے نظام کو رواں رکھنے اور نسل کی افزائش کے لئے مادی وجود کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ مگر مادی وجود کو سب کچھ سمجھ لینے سے آدمی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے اور فریب میں زندگی گزارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کل آئے گی — کل نہیں آتی۔ حال کو بہتر بنانے لئے شب و روز ایک کر دیتا ہے — حال ہر لمحہ ریت کے ذرّات کی طرح پھسل کر ماضی بن رہا ہے۔ ماضی یعنی جہاں سے وہ آیا ہے، اس مقام کو یاد داشت میں لانے کی کوشش نہیں کرتا۔ قانون ہے کہ ماضی سے واقف ہو کر ہی آدمی وقت سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

باطنی رخ کو اہمیت دی جائے تو یہ اپنی دنیا کے اسرار ہم پر کھولتی ہے اور روح سے متعارف کراتی ہے۔ روح تبدیل نہیں ہوتی کیوں کہ وہ اللہ کا امر ہے۔ تبدیل نہ ہونے والی شے محفوظ رہتی ہے۔

کائنات قوانین پر قائم ہے جن کو سمجھ لیا جائے تو ان پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً جسم کا قانون گھٹنا بڑھنا ہے، روح اس عمل سے محفوظ ہے۔ جو شے بدلتی ہے، سمجھ جائیں کہ وہ حقیقت نہیں ہے۔

وجود جسم اور روح سے مرکب ہے۔ جسم مٹی سے بنا ہے، اس کی کشش مٹی میں ہے۔ سونا اور ہیرا قیمتی

تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کی کم مقدار کی مالیت بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ دراصل مٹی کے روپ ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں ہم نے مٹی کی اتنی زیادہ قیمت لگالی ہے جب کہ مٹی کے معنی ٹوٹ پھوٹ اور تغیر ہے۔ غذائیں بھی مٹی ہیں ، پانی بھی مٹی ہے ، گھر ، اولاد، جائیداد، کاروبار سب مٹی ہیں۔

باطن سے گریز اور مٹی میں کشش مادی دنیا ہے۔

باطن میں کشش اور مٹی سے گریز باطنی دنیا ہے۔

ان سب کے باوجود ہم مٹی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر مٹی کو بالکل کنارے کر دیا جائے تو مخلوقات کا وجود کیسے زیر بحث آئے گا؟

موضوع کی ابتدا نیکی کی حفاظت سے ہوئی۔ مٹی بھی اللہ کی تخلیق ہے اور یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ ہم مٹی کی نفی نہیں کرتے ، مٹی کے ظاہری رخ سڑاند سے محفوظ رہنے کی بات کرتے ہیں کیوں کہ سڑاند سے نکل کر ہی مٹی کے جسم کی حفاظت ہوسکتی ہے۔ کیا ہم نے ایسی برگزیدہ ہستیوں کے واقعات نہیں پڑھے کہ انتقال کے سالوں بعد بھی ان کے جسد خاکی قبروں میں محفوظ ہیں — ؟ اس لئے کہ یہ ہستیاں اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرز فکر کو اختیار کر کے مٹی کے مادی رخ سڑاند سے محفوظ ہوگئیں۔

روح نے ظاہر ہونے کے لئے خاکی لباس کو پردہ بنایا ہے۔ اسی مٹی میں تخلیقی مقداروں کے فارمولے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مٹی میں اتنی وسعت رکھی ہے کہ یہ ہر شے کو زمین فراہم کرتی ہے، نشوونما کرتی ہے اور سب کا لباس بن جاتی ہے۔

ہم مٹی کے اس رخ میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں تعفن ہے۔ تعفن ہمارے عمل میں شامل ہوگیا ہے۔

★ کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں سکون ہو۔

★ نفسانفسی کے تعفن نے رشتوں کو گہن لگا دیا ہے۔

★ ایک دوسرے کی بات برداشت نہیں ہوتی، اونچی آواز میں بات کرتے ہیں۔

★ معاف نہیں کرتے اور نہ معافی مانگتے ہیں۔

★ دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں۔ بے حسی اتنی ہے کہ احساس نہیں ہوتا ہم لوگوں کے لئے آزار بن گئے ہیں۔

★ سب میں انا ہے جو اتنی پھول جاتی ہے کہ پھیلاؤ کی وجہ سے اپنے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

کیا یہ سب ٹوٹ پھوٹ نہیں ہے — ؟

دنیا کے بجائے اللہ کی محبت میں جو عمل انجام دیا جاتا ہے وہ نیکی ہے۔ ایسے اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ ذہن میں سوال آسکتا ہے اور آنا بھی چاہئے کہ روح نظر آتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے پھر اس سے رابطہ کیسے ہو؟

جواب یہ ہے کہ کیا آپ اپنے اندر حرکت محسوس کرتے ہیں، یہی حرکت روح ہے۔

آسان قانون یاد رکھیں کہ اللہ کی خوشی کے لئے جو کام کیا جاتا ہے، وہ ہمیں روح سے قریب کر دیتا ہے اور روح ہمیں اللہ سے قریب کرتی ہے۔

جسمانی اعمال کا محرک روح ہے اور عمل کی بنیاد

نیت ہے۔ نیت میں خیر ہے اور شر بھی۔ مٹی کی ظاہری خصوصیات کو دیکھتے ہوئے فرشتوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا تھا کہ یہ خون بہائے گا فساد کرے گا۔

اللہ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ خالق کائنات نے اپنے پروگرام کے مطابق مٹی میں روح پھونکی اور اسے زندگی کے جوہر سے روشناس کیا۔ فرشتوں نے اعتراف کیا کہ بے شک جو آپ جانتے ہیں، وہ ہم نہیں جانتے۔ وضاحت یہ ہے کہ آدمی کو اللہ نے وہ علم دیا ہے جو فرشتوں اور جنات کو حاصل نہیں۔

''اور ہم نے آدم کو علم الاسما عطا کیا۔'' (البقرۃ: ۳۱)

کائنات میں جتنی مخلوقات ہیں، ان میں نوع آدم علم الاسما کی امین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا، بے شک وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔'' (الاحزاب:۷۲)

جنت میں نافرمانی کی وجہ سے نیابت کا علم بھول کے خانہ میں چلا گیا۔ محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''خالق کائنات نے نوع آدم کو اپنی امانت عطا کی اور یہ امانت ''علم الاسما'' ہے۔ لیکن انسان جب اس علم کو سیکھ کر بھول گیا تو آدمی کی کیٹیگری میں داخل ہو گیا۔ اس نے امانت کی قدر نہیں کی، الوژن کی قدر کی۔ الوژن کو قبول کر لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ظالم اور جاہل ہے۔''

جنت سے سزا کے طور پر ہم زمین پر آئے جہاں ان ساری مخلوقات کے پابند ہو گئے جن پر اللہ نے ہمیں خلیفہ بنایا ہے۔ کیا اس سے بڑی سزا ہو سکتی ہے؟

نیابت کا علم ہمارے اندر موجود ہے لیکن سزا قائم ہے جس کا مطلب ہے کہ نافرمانی ختم نہیں ہوئی۔ ہمیں نافرمانی چھوڑ کر اللہ کا فرماں بردار بننا ہے تاکہ ہم زمین پر نیابت کے امین بن جائیں۔ جو شخص امین ہوتا ہے اس میں خیانت نہیں ہوتی۔

ٹھنڈے دل سے سوچنا ہے کہ ہم جس ملک میں جاتے ہیں کیا وہاں کی آب و ہوا کے مطابق ضروریات کا سامان ساتھ نہیں لے جاتے؟ غیر ملک میں استعمال ہونے والی کرنسی کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ بندوبست نہ کریں تو ائیر پورٹ یا ریلوے اسٹیشن سے نکلتے ہی پریشان ہو جائیں گے۔

یہ دنیا مسافر خانہ ہے۔ ہمارا اگلا اسٹیشن عالم اعراف ہے جہاں کا زر مبادلہ روشنی ہے۔ روشنی اچھے اعمال سے ذخیرہ ہوتی ہے اور روشنی کے ذخیرہ کو ہمیں یہاں سے لے کر جانا ہے۔ نیک لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے لئے ارشاد باری ہے،

''اس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا، 'آج بشارت ہے تمہارے لئے'۔ جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔

جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

(الحدید:۱۲)

نیکی کرنے کے بعد قلب کو اطمینان ہوتا ہے یہی اطمینان روشنی ہے۔ اللہ کی رضا وخوش نودی ہمارے لئے روشنی ہے جس کو ہمارے لئے اس دنیا اور بعد کی دنیاؤں میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

"اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملاؤ جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہ گئی اور صاف چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ میں نہیں آتا۔ اور اللہ منکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (البقرۃ: ۲۶۴)

بات کو عام فہم اور سادہ طریقہ سے سمجھئے۔

نیکی روشنی ہے اور بدی اندھیرا ہے۔ روشن ماحول میں تھوڑا سا اندھیرا کیا جائے تو محسوس نہیں ہوتا جب کہ اندھیرے میں ایک دیا سلائی آس پاس ماحول کو روشن کر دیتی ہے۔

خالق کائنات کی شان کبریائی، محبت اور کرم ہے کہ تھوڑی سی روشنی زیادہ اندھیرے پر غالب آجاتی ہے جب کہ زیادہ اندھیرا کم روشنی کو بھی چھپا نہیں سکتا۔

سب کے درمیاں سب سے الگ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمین ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو
ہے عشیرہ اور ان کا دودماں* سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ

جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ

کلبۂ* احزاں ہے روشن ان کا جس مہتاب سے
ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ

سینکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل ان کا تو واں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمین ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

(کلام: خواجہ الطاف حسین حالیؔ)

---

*دودماں (اہل وعیال)

*کلبہ (تنگ و تاریک حجرہ)

سید اسد علی

سراب

جو لوگ دولت کو اپنی کمائی سمجھتے ہیں اور دوسروں کا حق ادا نہیں کرتے، دولت انہیں بے سکون کر دیتی ہے۔

عابد کے ابا سارا دن محنت و مشقت کر کے جو کچھ کماتے اس سے دو وقت کی روٹی پوری ہو جاتی تھی۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ پھر اس کے ابا کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ گردوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ لوگوں سے ادھار لے کر علاج کروایا لیکن صحت یاب نہ ہو سکے۔ ڈاکٹروں نے کہا، اللہ کی یہی مرضی تھی۔

عابد کی عمر 12 سال تھی جب باپ کے انتقال کے بعد ماں نے گھروں میں کام کرنا شروع کیا۔ وہ اکثر ماں کے ساتھ کام پر جاتا اور دیکھتا کہ اس کی ماں محنت سے کام کرتی ہے لیکن پھر بھی اسے باتیں سننی پڑتی ہیں۔ ماں سے بنگلے والوں کے رویہ پر گلہ کیا تو اس نے کہا،

''ہمارا یہی نصیب ہے۔''

جس بنگلے میں ماں کام کرتی تھی ایک روز وہاں بڑی گاڑی میں مہمان آئے جن کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ معصوم بچہ نے سوچا، عزت بڑی گاڑی اور بڑے گھر کی وجہ سے ملتی ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ صاحب نے دیکھ لیا اور اپنے بیٹے کو انگریزی میں ڈانٹتے ہوئے کہا، یہ اچھا بچہ نہیں ہے، اس کے ساتھ مت کھیلو۔

عابد انگریزی سے نابلد تھا۔ بھلا پسماندہ علاقہ کے اسکول میں پڑھنے والا انگریزی کیسے سمجھتا۔ لہجہ سے اندازہ ہوگیا کہ صاحب نے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کا کھیلنا سخت ناپسند کیا ہے۔ معصوم ذہن پر وہ جملے نقش ہوگئے۔ اگرچہ معنی معلوم نہیں تھے لیکن اس نے ان جملوں کو یاد کر لیا اور اکثر گھر میں دہراتا۔ ماں بیٹے کو انگریزی بولتا ہوا دیکھتی تو بہت خوش ہوتی کہ بیٹا اسکول میں انگریزی سیکھ رہا ہے۔ انگریزی بولنے پر سب اس کی عزت کریں گے۔ ایک روز اسکول کے استاد سے ان جملوں کے معنی معلوم کئے، استاد نے بتایا کہ ''یہ اچھا بچہ نہیں ہے، اس کے ساتھ مت کھیلو۔''

عابد کو دھچکا لگا کہ کیا غریب کا بچہ اچھا نہیں ہوتا؟

اس نے سوچا کہ صاحب نے اس پر اچھا نہ ہونے کی مہر کیوں لگائی؟ یاد آیا کہ اس نے فیروزی رنگ کی پینٹ پہنی ہوئی تھی جو ماں نے بازار سے خریدی تھی۔ نتیجہ اخذ

کیا کہ آدمی کا دل کتنا ہی میلا کیوں نہ ہو، اسے کوئی برا نہیں کہے گا لیکن کپڑے اچھے نہ ہوں تو لوگ ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔

ماں جب پراٹھا بنا کر کھلاتی تھی تو اس کی محبت اور حلاوت پراٹھے کو لذیذ بنا دیتی تھی۔ کبھی کبھار اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

وہ پوچھتا، ماں آپ کیوں روتی ہیں؟

وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کہتی، بیٹا! آج تو نے پورا پراٹھا کھایا ہے اس لئے خوشی سے آنسو آگئے ہیں۔

ماں اس کے سامنے تنگ دستی کا ذکر نہیں کرتی تھی البتہ یہ ضرور کہتی تھی کہ میرا بیٹا بڑا آدمی بنے گا۔

کچھ عرصہ بعد عابد کی ماں سخت بیمار ہوگئی۔ بنگلے والوں سے مدد کی درخواست کی۔ کسی نے خاطر خواہ تعاون نہیں کیا۔ وہ دیکھتا کہ ان کی خواتین ہزاروں روپے کے کپڑے اور دوسری چیزیں خریدتی ہیں لیکن یہ لوگ غریب کا علاج نہیں کرواسکتے۔ جب وہ ماں کی بیماری کا ذکر کرتا تو وہ سمجھتے تھے کہ عابد جھوٹ بول رہا ہے کیوں کہ ان کہنا تھا کہ غریب لوگ بہانہ بنا کر پیسے لینے کے چکر میں رہتے ہیں۔

بالآخر ماں بھی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ وہ بہت رویا۔ بے حد تکلیف تھی کہ ماں اور باپ دونوں کسمپرسی میں مرگئے اور وہ ہجوم میں تنہا رہ گیا۔ اس وقت عمر اٹھارہ سال تھی۔ مادیت میں مبتلا لوگوں کا تجزیہ کر کے اس نے جانا کہ لوگ بظاہر ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہر فرد پجاری ہے۔ کسی نے اپنے اندر دولت کا بت تراشا ہوا ہے تو کوئی نمود و نمائش کی پوجا کرتا ہے۔ کوئی دل میں اقتدار پرستی کا محل بنا کر بیٹھا ہے تو بعض دعاؤں میں جاہ و منصب مانگتے ہیں۔

وہ بھی اسی راستہ کا مسافر بن گیا۔ پہلے محنت مزدوری کی اور چھوٹی دکان کھول لی۔ آہستہ آہستہ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر کے بہت منافع کمایا اور بڑی دکان کھول لی، نوکر رکھ لئے۔ اچھا گھر اور نئے ماڈل کی گاڑی پر اسے فخر تھا۔ سیاہ رنگ کی چمکتی ہوئی گاڑی سڑک پر دور سے نمودار ہوتی تو لوگ متاثر ہوتے اور کہتے کہ سیٹھ عابد کی گاڑی آرہی ہے۔

عابد کی طبیعت بچپن سے حساس تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ احساس محرومی کی وجہ سے اس نے دولت کا انبار لگالیا لیکن وہ لوگ جو جدّی پشتی امیر ہیں، انہوں نے کیوں دولت کو خدا بنا رکھا ہے؟ وہ کس محرومی کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟ جب جواب نہیں ملتا تو وہ خود کو دوسری طرف مصروف کرلیتا تھا۔

پھر زندگی نے نیا موڑ لیا اور عابد کو بدل دیا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ شہر کے بڑے اسپتال کے خصوصی وارڈ میں داخل کیا گیا۔ اللہ نے حفاظت کی۔ بیوی بچے موجود تھے لیکن وہ اسپتال میں اکیلا نوکروں کے رحم و کرم پر تھا۔ بیوی بچے مصروفیت کی وجہ سے دو تین دن بعد آتے۔

کھانا اور ضروری اشیا ملازم لے کر آتا تھا۔

عابد کا رشتوں پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ وہ سوچتا کہ میں نے ان کے لئے کیا نہیں کیا اور یہ مشکل وقت میں مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ دس دن بعد خصوصی وارڈ کی تنہائی اس پر گراں گزرنے لگی۔ اسپتال کے عملہ سے درخواست کر کے بستر جنرل وارڈ میں منتقل کروالیا۔

یہاں اسے پتہ چلا کہ جنرل وارڈ میں ہر تھوڑے دن بعد بزرگ آتے ہیں جو پھولوں والے بابا کے نام سے مشہور ہیں اور ہر مریض کو پھول دیتے ہیں، خیریت معلوم کرتے ہیں اور صحت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ کوئی خواب بیان کرے تو تعبیر بھی بتاتے ہیں۔

پھولوں والے بابا آئے۔ ہر مریض کو ایک پھول دیا عابد کے حصہ میں جو پھول آیا وہ سفید رنگ کا تھا۔ عابد نے بے ساختہ پوچھا، یہ کتنے کا ہے؟

پھولوں والے بابا مسکرائے اور کہا، ہر چیز پیسوں سے خریدی نہیں جاتی۔ یہ پھول انمول ہے، رکھ لو۔

وہ اگلے مریض کی طرف بڑھ گئے۔ عابد کو جواب سن کر لگا کہ کسی نے اس کے نظریات کو رد کر دیا ہے۔ ایک دم ذہن خالی ہو گیا۔ ایک جملے کی تکرار تھی کہ پیسوں سے ہر چیز کیوں خریدی نہیں جا سکتی؟ اگر پیسے ہوتے تو اپنے ماں باپ کو مرنے سے بچا سکتا تھا۔ خود سے لڑتا رہا اور لڑتے لڑتے سو گیا۔ خواب میں دیکھا،

''وہ ایک جنگلی قبیلہ کا فرد ہے۔ قبیلہ کے افراد نہ صرف ایک دوسرے سے لڑتے ہیں بلکہ ذرا سی بات پر دوسرے قبیلہ کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایک دن اس کے قبیلہ کے ساتھی پرندے شکار کر کے لائے۔ کسی نے دو پرندے شکار کئے اور کسی نے چار شکار کئے تھے۔ ان کو دیکھ کر عابد کے اندر حرص پیدا ہوئی اور سوچا کہ کل میں شکار پر جاؤں گا اور سب سے زیادہ پرندے شکار کر کے لاؤں گا۔

اگلی صبح وہ تیر کمان لے کر شکار پر روانہ ہوا۔ کھلے میدان میں پہنچا، فضا میں اڑتے پرندوں کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا۔ اس نے پرندوں کے بجائے ان کی پرچھائیوں پر تیر اندازی شروع کر دی۔ جس سائے پر تیر لگتا وہ خوشی سے نہال ہو جاتا کہ پرندے کا شکار کر لیا ہے۔ دوڑ کے جاتا تا کہ شکار اٹھائے لیکن سایہ آگے بڑھ جاتا اور وہ مایوس ہوتا کہ وہ شکار میں کام یاب نہیں ہوا۔ پھر وہ دوسرے پرندے کے سائے کا نشانہ لیتا۔ صبح سے شام ہو گئی۔ بھوک پیاس سے وہ نڈھال خالی ہاتھ واپس آیا۔''

نیند سے جاگا تو خواب یاد آیا اور اس نے اپنی عقل پر ماتم کیا کہ خواب میں یہ بات سمجھ کیوں نہیں آئی کہ پرندے فضا میں اڑتے ہیں۔ ان کا مسکن فضا ہے، زمین پر محض سایہ پڑتا ہے۔ اگر وہ فضا کی طرف رخ کر کے نشانہ باندھتا تو کچھ نہ کچھ ہاتھ آ جاتا لیکن پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے سے خالی ہاتھ تھا، خالی ہاتھ رہ گیا۔

کچھ دن بعد دوسرا خواب دیکھا،

''صحرا میں سفر کر رہا ہے۔ پیٹھ پر ٹھنڈے پانی کا مشکیزہ

ہے۔سخت گرمی ہے اور لُو چل رہی ہے۔کبھی کبھار گردوغبار سے بھرپور ہوا چلتی ہے اور ماحول میں غبار کی چادر پھیل جاتی ہے۔اس دوران پیاس لگتی ہے مگر وہ بھول جاتا ہے کہ ٹھنڈا پانی موجود ہے جسے پی کر پیاس بجھ سکتی ہے۔اس کے برعکس وہ صحرا میں پانی تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔دیکھتا ہے کہ دور نخلستان ہے جہاں پانی کی جھیل نظر آرہی ہے۔وہ اس کی طرف دوڑ لگا دیتا ہے۔باوجود یہ کہ صحرا میں وہ اکیلا ہے، سوچتا ہے کہ سب سے پہلے اس جھیل پر پہنچنا ہے۔ہانپتا، کانپتا اور دوڑتا ہوا جب قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ جھیل نہیں، سراب تھا۔دوبارہ صحرا میں پانی کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ریت کے ٹیلوں پر چڑھ کر دائیں بائیں آگے پیچھے دور دور تک نگاہ دوڑائی جو تھک کر واپس آ گئی لیکن پانی نہیں ملا۔پیاس کی شدت بڑھ گئی۔پھر دور کسی مقام پر پانی کا ذخیرہ نظر آیا۔اس خیال کے ساتھ دوڑا کہ پانی تک پہنچنے والوں میں وہ سب سے پہلے ہو۔وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ بھی سراب تھا۔پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔عابد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ سراب کے پیچھے دوڑ رہا ہے اور نہ یاد آیا کہ ٹھنڈا پانی مشکیزہ میں ہے۔وہ سراب کے پیچھے دوڑتا رہا اور تھک ہار کر گر گیا۔''

آنکھ کھلی تو وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔اپنی سمجھ کو کوسنے لگا کہ پاس موجود پانی سے پیاس کیوں نہیں بجھائی۔کیوں سراب کے پیچھے دوڑتا رہا۔لیکن یہ تو خواب تھا اور میں بلاوجہ سنجیدہ ہو رہا ہوں۔مگر خواب کے نقوش ذہن میں موجود رہے۔

پھولوں والے بابا کا انتظار تھا کہ ان سے تعبیر معلوم کی جائے۔تقریباً ایک ماہ اسپتال میں رہا مگر وہ نہیں آئے۔بالآخر صحت یاب ہو کر گھر آ گیا۔

اسپتال سے آنے کے بعد بابا کی تلاش میں وہاں دوبارہ گیا۔بتایا گیا کہ اب وہ نہیں آتے۔کسی کو ٹھکانہ معلوم نہیں تھا۔ان کا انتظار کیا، انتظار تلاش میں تبدیل ہوا اور تلاش جستجو بن گئی۔لوگوں سے ذکر کیا۔نام اور پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

ایک دن ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا کہ سگنل پر گاڑی رکی۔پھولوں والے بابا سگنل پر کھڑے تھے۔پُرسکون چہرہ، باوقار انداز۔فوراً گاڑی سے اترا۔ڈرائیور نے حیرت سے دیکھا کہ صاحب کہاں جا رہے ہیں۔عابد نے بابا کے پاس پہنچ کر ہاتھ تھام لیا اور کہا، بابا مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں۔

بابا نے کہا، تم فلاں دن اور وقت پر خانقاہ آجاؤ۔

خانقاہ کا پتہ نوٹ کر لیا اور مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ان کو بتایا کہ میں نے آپ کو کہاں نہیں ڈھونڈا! آپ کدھر غائب ہو گئے تھے، اسپتال آنا کیوں چھوڑ دیا؟

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، بہت دولت ہے تمہارے پاس، تلاش کر لیتے مجھے۔

عابد نے اعتراف کیا، ہر کام دولت سے نہیں ہوتا۔مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟

آپ سے خوابوں کی راہ نمائی چاہتا تھا۔

بزرگ نے خواب سن کر فرمایا، بیٹا! جب تک قبولیت نہ ہو بات نہیں بنتی۔

عابد کچھ نہیں سمجھا اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

بزرگ نے کہا، میں تم سے کچھ سوالات کرتا ہوں غور کر کے جواب دینا۔

۱۔ تیز دھوپ میں رکھی ہوئی برف کے متعلق آدمی سوچے کہ یہ زندگی کا سرمایہ ثابت ہوگی، کیا یہ حقیقی طرزِ فکر ہے ــــ؟

۲۔ کیا ہاتھوں سے بنائی گئی کاغذ کی کشتیوں سے توقع رکھنی چاہئے کہ یہ ہمیں بلند و بالا لہروں پر سے بحفاظت گزار کر ساحل پر پہنچا دیں گی ــــ؟

سوالات پر سوچتا ہوا خانقاہ سے باہر آیا۔ دو دن تک سوچا لیکن بے سود! جواب نہیں ملا کہ خوابوں کا سوالات سے کیا تعلق ہے۔ ذہن بھاری ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔ اس نے ذہن دو اور دو پانچ بنانے پر لگا دیا تھا پھر یہ باتیں کیسے سمجھ میں آتیں؟

دل میں دبی خواہشات نے بہکایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان باتوں پر غور کرنے اور بابا کے راستہ پر چلنے سے عیش و عشرت کی زندگی ختم ہو جائے۔ چار لوگ سلام کرتے ہیں وہ عزت بھی رخصت ہو جائے گی۔

ضمیر کی آواز گونجی کہ لوگ تمہاری عزت کرتے ہیں یا پیسوں کی؟ ایسے لوگوں سے عزت کی توقع کیوں رکھی جائے جو پیسوں کی وجہ سے تمہیں سلام کرتے ہیں؟

دولت کے باوجود تم بے سکون کیوں ہو؟ کیا تم سراب کے پیچھے نہیں دوڑ رہے؟ کہیں تو خلا موجود ہے۔ غور کرو۔ ممکن ہے کہ ظلمت اجالے میں بدل جائے۔

راہ نمائی کی شمع کو خواہشات کے منہ زور طوفان سے بچایا اور ان سوالات پر غور کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو زندگی کی تصویروں کو ان سوالات کے آئینہ میں دیکھنا شروع کیا۔ ایک مرحلہ پر خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آدمی اپنے جیسے آدمیوں میں محترم اور مقبول ہو جائے۔

ضمیر نے کہا، یہ کیسی کامیابی اور کیسا عروج ہے کہ جس کے چھن جانے کا ہر لمحہ ڈر رہتا ہے۔ کیا یہ پگھلتی ہوئی برف اور کاغذ کی کشتیاں نہیں ہیں؟

آگہی پر وہ کانپ گیا اور نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔

پھولوں والے بابا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ تلاوت فرما رہے تھے۔

''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔''

(النحل: ۹۶)

اس کے بعد فرمایا، آدمی نہیں جانتا کہ وہ کون سی دنیا سے آیا ہے اور اسے یقین نہیں ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور دنیا میں منتقل ہوگا۔ ہزاروں لاکھوں سال میں ایک فرد بھی انتقال یعنی مقام کی تبدیلی کے عمل سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ البتہ ہر ارادہ، ہر قدم اور ہر لمحہ

اس خیال کے ساتھ گزرتا ہے کہ موت نہیں آئے گی۔ یہ خودفریبی ہے جو حقیقی سکون اور خوشی کے راستہ میں دیوار ہے۔ آدمی خاکی جسم میں قید ہے جہاں تنگی ہے، گھٹن ہے، اندھیرا ہے۔ اس قید کو آزادی اور قید خانہ کو جنت سمجھتا ہے۔ قدرت ہر قدم پر احساس دلاتی ہے کہ یہ سراب ہے، دھوکا اور منافقت ہے لیکن آدمی سمجھنا نہیں چاہتا۔ وہ سونے چاندی کا ڈھیر لگا کر خود کو محفوظ سمجھتا ہے۔ یہ عمل احساس محرومی، عدم تحفظ اور شکوک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سوچ زہریلی ہو جاتی ہے۔ دن میں چین ملتا ہے نہ رات میں سکون، زندگی کرب میں گزرتی ہے۔ بالآخر بیماریوں کے لئے لقمۂ تر بن کر خالی ہاتھ آنے والا خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔

عابد نے پوچھا، اے روشن ضمیر بزرگ! سمجھنا چاہتا ہوں کہ میں سراب سے کیسے نکل سکتا ہوں؟

بزرگ نے فرمایا، ظاہری وجود کھنکھناتی مٹی سے بنا ہے جس میں ہر لمحہ تغیر اور تبدیلی ہے لیکن انسان مادی وجود نہیں ہے بلکہ مادی وجود میں قیام پذیر ہے۔ جب خاکی جسم سے رشتہ منقطع ہوتا ہے تو جان بچانے والی لاکھوں کی مشینری ہونے کے باوجود آدمی زندگی نہیں خرید سکتا۔ سراب یا الوژن سے نکلنے کے لئے اسے معلوم ہونا ضروری ہے کہ سکون اور عزت من کی دولت سے ملتی ہے۔ تن کی دولت کو من کی دولت پر خرچ کرو۔ جب من کی حقیقت عیاں ہوتی ہے تو دل کا غبار اڑ جاتا ہے، فضا صاف ہوتی ہے تو ہر منظر واضح ہوتا ہے۔ بلاتفریق مذہب وملت، رنگ ونسل ہر فرد کے اندر ایک نظام ہے جو غلطی کا احساس دلاتا ہے اور ماورائی ہستی کی محبت سے قریب کرتا ہے۔ من کی دنیا سے واقف ہونا چاہتے ہو تو مراقبہ کرو اور ذہن ماورائی ہستی کی طرف مرکوز کر دو۔

ہدایات پر خلوص کے ساتھ عمل کیا اور سکون سے متعارف ہو گیا۔ ایک دن مراقبہ کے دوران آواز آئی،

اے آدم زاد! دولت بری شے نہیں ہے۔ سکون چاہتا ہے تو اس دولت میں سے جن لوگوں کا حق ہے، انہیں ادا کر دے تجھے سکون نصیب ہو جائے گا۔ جو لوگ دولت کو اپنی کمائی سمجھتے ہیں اور دوسروں کا حق ادا نہیں کرتے، دولت انہیں بے سکون کر دیتی ہے۔ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر!

عابد مراقبہ سے اٹھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے لوگوں کے حقوق غصب کرنے کا راستہ ترک کر دیا۔ اسپتال کھولا جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ اس نے تنہا زندگی گزاری تھی۔ اب اس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے بچوں اور دوسرے لوگوں میں احساس اجاگر کرے کہ آدمی آدمی کی دوا ہے۔ اس کا کاروباری منافع تو کم ہو گیا تھا لیکن اسے خوشی تھی کہ اس نے سراب کی حقیقت جان لی ہے۔ بزرگ کی پڑھی ہوئی آیت یاد آئی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا'' (العنکبوت:۶۴)

اقتباسات

’’ماہنامہ قلندر شعور‘‘ کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم وبیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

روحانیت میں عمل پہلے اور علم بعد میں ملتا ہے جب کہ مادیت اس کے برعکس ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اپنے مرشد کے حکم پر پوری جوانی خانقاہ میں پانی بھرنے میں گزار دی۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ اتنی محنت نہ کرتے یا اس محنت کی توجیہ جاننا شروع کر دیتے کہ میں تو روحانی علوم حاصل کرنے آیا ہوں نہ کہ پانی بھرنے یا یہ کہ پانی بھرنے کا علم سے کیا تعلق ہے؟ تو وہ یہ علم حاصل نہ کر پاتے۔ روحانیت کا پہلا سبق ’’باادب بانصیب‘‘ اور دوسرا سبق عمل ہے۔

(مرسلہ: یاسین احمد، کتاب: چشم ماروشن)

علم حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ میں صرف دولت کماؤں، لوگ میری عزت کریں۔ میں لوگوں میں ممتاز ہو جاؤں۔ علم حاصل کرنے سے یہ سب خود بہ خود حاصل ہو جاتا ہے۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس لئے علم حاصل کر رہے ہیں تا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نظام کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ آپ کو یہ بات زیادہ اچھی طرح سے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہیں اور ہم مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے اور اس پوری دنیا کے مالک ہیں۔ وہ کیسے تخلیق کرتے ہیں، کیسے اپنی مخلوق کی پرورش کرتے ہیں، اپنی مخلوق کو وسائل فراہم کرنے کا کیسا نظام بنایا ہے اور جو نظام بنایا ہے اس کی دیکھ بھال کیسے کرتے ہیں؟ یہ سب باتیں قرآن میں درج ہیں اس لئے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ عربی زبان کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی یاد کریں۔

(مرسلہ: ثناء علی، کتاب: ہمارے بچے)

بارہا ہم کوئی چیز بھول جاتے ہیں اور پھر وہ از خود یاد آجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس چیز کا خیال کہاں سے آتا ہے؟ ہر دیکھی اور سنی ہوئی چیز لاشعور میں محفوظ ہے اور وہیں سے شعور میں آجاتی ہے۔ لاشعور ایک ریکارڈ ہے جہاں تمام معلومات ذخیرہ ہیں۔ جب ہم کسی شخص کا نام یا شعر کا مصرع ثانی بھول جاتے ہیں تو بے چینی شروع ہوجاتی ہے۔ اس بے چینی سے لہریں پیدا ہوتی ہیں اور مذکورہ شے کے ریکارڈ کو متحرک کرتی ہیں، ریکارڈ لہروں کے ذریعے بھولی ہوئی شے کا پیغام ہمیں بھیجتا ہے۔ دماغ میں تصویر بنتی ہے جسے دیکھ کر بھولی ہوئی شے حافظہ میں آجاتی ہے۔ (مرسلہ: خالد جہانزیب، کراچی)

قرآن کریم میں زمین پر عکس کی صورت میں اشیا اور فضا میں پھیلی ہوئی کہکشاؤں کے بارے میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ساتھ ہی کائنات کے رازوں پر سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ توجہ طلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم میں غور وفکر کرتے ہیں، دنیا والے (مادی سوچ رکھنے والے) ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو مادہ کی مادی توجیہ پیش کرتے ہیں اور ایسے محققین کو ''سائنس دان'' فلاسفر اور موجد قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ کائنات اتنی پُر اسرار اور پیچیدہ ہے کہ بہت سے مسائل آج تک انسانی فہم سے بالا ہیں۔

نبی کریمؐ کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہوگیا ہے۔ انبیائے کرام کے مشن کو جاری رکھنے کے لئے اولیاء اللہ ہر دور میں موجود ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو قرآن کریم میں تفکر کرتی ہیں، ہدایات ربانی کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں اور ان کی روشنی میں زندگی گزارتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو 'مومن' کہا گیا ہے۔

(مرسلہ: وہاج شاکر۔ لاہور، کتاب: پیر حاضر شاہ)

اللہ کے قانون کے مطابق یہاں ہر چیز دو رخوں پر قائم ہے۔ جب تک آپ خوش ہیں، غم خوشی کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ جب تک آپ غمگین ہیں، خوشی غم کے ساتھ ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ خوشی اور غم الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں یعنی ابھی خوشی ہے تو ابھی غم ہے۔ ابھی غم ہے تو ابھی خوشی ہے۔ بالکل اسی طرح رات اور دن الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی دن ہے ابھی رات ہے۔ ابھی رات ہے تو ابھی دن ہے۔ اسی صورت سے خوشی اور غم ایک دوسرے سے ردّ و بدل ہو رہے ہیں اور ردّ و بدل ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کی سوچ محدود ہے۔ جب آدمی محدود سوچ سے آزاد ہوجاتا ہے تو اس کے اندر سے خوشی اور غم دونوں نکل جاتے ہیں، صرف استغنا باقی رہ جاتا ہے۔ اور استغنا کی کیفیت میں تغیر نہیں ہے۔

(مرسلہ: جہاں آرا، حیدرآباد)

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ و چمن، عروج و زوال، عشق و سرمستی اور فنا و بقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کا تعلق عرب نژاد پاکستانی خاندان سے تھا۔ پاکستان میں کچھ عرصہ قیام کے دوران اپنی دوست نیلم کے گھر ذکر و فکر کی محفل میں ردا کی بزرگ سے ملاقات ہوئی جن کی توجہ نے طبیعت میں روحانیت کی طرف میلان پیدا کر دیا۔ ردا کی بہن کی شادی پاکستان میں ہوئی۔ والد کے برطانیہ تبادلہ کی وجہ سے ردا اور نیلم کے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا۔ ردا نے برطانیہ کی ایک یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں کاربن ڈیٹنگ کے پروفیسر جی آر چوہان کے لئے ردا کی شخصیت معمہ تھی جسے جاننے میں وہ ناکام رہے۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کے بعد جب پی ایچ ڈی آخری مراحل میں تھی تو ردا کے والد کا پھر پاکستان تبادلہ ہو گیا۔ ردا نے تھیسز مکمل کرنے کے لئے ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کا انتخاب کیا جہاں صدیوں پرانی داستان صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہونے کے لئے ردا کی منتظر تھی۔ اب آگے پڑھئے۔

گاڑی کی رفتار سست تھی مگر ڈرائیور بابا نے گھبراہٹ میں پوری طاقت سے بریک دبایا۔ گاڑی رکتے ہی بوڑھا گھوم کر میری طرف آیا اور زور زور سے شیشہ پیٹنے لگا۔ گھبرا کر شیشہ نیچے کیا تو وہ سر کھڑکی کے نزدیک لایا اور غضب ناک ہو کر چیخا۔

''میری محنت بھنگ کی تو میں نہیں چھوڑوں گا۔''

یہ کہتے ہی وہ پیچھے ہٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گاڑی سے دور ہو گیا۔ میں حیران و پریشان بوڑھے شخص کو دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

ڈرائیور بابا دروازہ کھول کر باہر آئے، وہ غصہ میں تھے اور بدتمیزی پر اسے مزہ چکھانا چاہتے تھے۔

میں نے کہا، پاگل ہے بابا آپ گاڑی میں بیٹھیں۔

بوڑھا برق رفتاری سے کافی دور جا چکا تھا۔

ڈرائیور بابا بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

بیٹا یہ کون تھا اور کس محنت کی بات کر رہا تھا؟

میرے پاس ان کے سوال کا جواب نہیں تھا۔

بابا لگتا ہے کہ پاگل ہے، چھوڑ دیں۔

معاملہ الجھتا جا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر تاریخ کی کتب نکالیں۔ خاصا مواد انٹرنیٹ کے ذریعے میسر آ گیا۔ بقیہ معلومات کے لئے کتابوں کی ورق گردانی شروع

کی۔خصوصاً اس دور میں بولی جانے والی زبان سے متعلق اشکال و الفاظ اور کوڈز کو سمجھنے کی کوشش کی۔ معمولی کوشش خاصی کارگر ثابت ہوئی اور دو سے تین روز کی محنت سے میں نے زبان سے متعلق نوٹس تیار کر لئے جو میرے لئے کام یابی تھی۔

عموماً یہ کام فرد واحد کا نہیں ہوتا بلکہ کئی لوگ مل کر انجام دیتے ہیں اس کے باوجود اچھا خاصا وقت لگتا ہے۔لگتا تھا کہ قدرت راہ نمائی کر رہی تھی۔اس دوران میں کمرے سے بوقت ضرورت باہر نکلی۔کام مکمل ہوا تو جیسے معرکہ سر کرلیا ہو۔اب میں کسی حد تک اس قابل ہو چکی تھی کہ شہزادہ کے الفاظ سمجھ سکوں اور وہ جو کچھ مجھے بتانے کی کوشش کرتا رہا ہے،اس سے واقف ہو جاؤں۔

میرا ارادہ مضبوط تھا بس راہ نما کی کمی تھی۔نیلم سے ملاقات کی کوشش اور اس کا مل جانا اپنی جگہ مگر معلوم نہیں تھا کہ ملنے کے بعد بزرگ تک رسائی ہوگی یا نہیں۔

ایڈن برگ اسکاٹ لینڈ میں ہوتی تو پروفیسر جی آر چوہان یقیناً مدد کرتے۔اس پُر اسرار اور وحشت ناک بوڑھے سے خوف محسوس ہوا۔وہ دو مرتبہ میرے راستہ میں آیا تھا۔گھر میں کسی کو بھنک پڑتی تو طوفان کھڑا ہو جاتا۔ابو ویسے بھی میری اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔

خیال آیا کہ نیلم کے والد کا پتہ اسماعیل بھائی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔فون ملا کر تفصیلات بتائیں تو انہوں نے ایک دو دن کا وقت لیا۔میں مطمئن تھی کہ وہ جس کام کی ہامی بھرتے ہیں،اسے پورا کرتے ہیں۔

میں نے انہیں اور کچھ نہیں بتایا۔

آج عجیب کیفیت تھی۔ذہن بار بار خالی ہو جاتا اور ماحول میں آوازوں سے توجہ ہٹ جاتی۔آنکھیں کسی چیز پر کچھ دیر ٹھہرتیں تو مناظر غائب ہونے لگتے۔شعور زیر بار اور دل انجانے خوف کا شکار تھا۔بات گھوم پھر کر کسی اللہ کے دوست،ولیٔ کامل کی تلاش پر رک جاتی۔

کمرے سے باہر نہ نکلنے پر امی فکر مندی میں دو تین بار آ چکی تھیں۔اولاد کا ماں کے ساتھ تعلق ان دیکھے اور ان گنت تاروں پر مشتمل ہے۔ماں اولاد پر مشکل وقت کو بظاہر کچھ نہ جانتے ہوئے بھی محسوس کر لیتی ہے۔ان تاروں کی قوت کو ستّر گنا سے ضرب دیا جائے تو بندہ کی اللہ سے تعلق کی سمت روشن ہوتی ہے۔

امی میری کیفیات سے واقف نہیں تھیں مگر اس دباؤ کو محسوس کر رہی تھیں جو حواس خمسہ کے راستہ شعور پر بارِ گراں بنا ہوا تھا۔منتظر تھی کہ امی سو جائیں۔تھوڑی دیر میں ان کے کمرے کی بتی بند ہوگئی۔جب یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند میں چلی گئیں ہیں تو ڈرائیور بابا اور چوکیدار کی طرف توجہ گئی۔کھڑکی سے جھانک کر دیکھا،ڈرائیور بابا کوارٹر کی لائٹ بند کر کے لیٹ چکے تھے۔چوکیدار فاصلہ پر گیٹ کے ساتھ بنے کمرے میں موجود تھا۔

احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے نفسیاتی مریضہ یا بھوت پریت کا شکار سمجھ لے۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وضو کر کے دوزانو بیٹھی، کمر سیدھی کی، انگوٹھے اور برابر والی انگلی کو ملا کر دائرہ بنایا اور مراقبہ کیا۔ جسم اس حالت میں جتنا آرام اور راحت محسوس کرتا ہے اتنا کسی اور حالت میں نہیں کرتا۔ ابتدا میں یہ نشست تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے مگر باقاعدگی پیدا ہو تو جسم پُرسکون ہو جاتا ہے۔

ارتکاز ہوتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہلکی سنسناہٹ کے احساس کے ساتھ جسم میں سے ایک اور جسم علیحدہ ہوا۔ مٹی کا جسم ساکت اور حرکت دوسرے جسم میں منتقل ہوگئی۔ دوسرا جسم گریویٹی سے کسی حد تک آزاد تھا۔

خوش گوار اور اچھوتا احساس تھا— مٹی کے جسم سے وابستہ تکلیفوں سے آزاد۔ کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دوسرا جسم تیزی سے دفاعی حالت میں آیا اور اس کے ساتھ زوردار آواز سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور خوف ناک سیاہ گدھ کمرے میں گھس آیا۔ وہ کمرے کی چھت کے چاروں طرف گول گول گھوم رہا تھا اور بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔ آخر پنکھے پر بیٹھنے میں کامیاب ہوا اور کمرے کے فرش پر ڈھیر ساری غلاظت خارج کردی۔ پھر اڑان لی اور جس طرح کمرے میں داخل ہوا تھا، ویسے ہی باہر نکل گیا۔

میں دیوار سے لگ کر دل دہلا دینے والا منظر دیکھ رہی تھی جب کہ میرا مٹی کا وجود مراقبہ کی حالت میں تپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گدھ کی غلاظت پر نظر پڑی تو خوف کی لہریں وجود سے گزر گئیں۔ غلاظت تیزی سے چھوٹی چھوٹی مکڑیوں میں تبدیل ہو کر کمرے میں پھیل رہی تھی جیسے مکڑیاں ابل رہی ہوں۔ مکڑیوں کی ایک بڑی تعداد لشکر کی شکل میں تپائی پر موجود میرے مادی وجود کی سمت بڑھ رہی تھی۔ لرزا دینے والی صورت حال تھی۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ میرا غیر مادی وجود واپس جسم میں داخل ہو کر جسم کو دہشت ناک مکڑیوں سے بچائے۔ ارادہ کرتے ہی غیر مادی وجود جسم میں داخل ہوا، کئی زوردار جھٹکے لگے جیسے وجود سوئیوں کی زد میں آگیا ہو۔ جسم بھاری محسوس ہوا۔ سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ ہڑبڑا کر اٹھی تو چکرا گئے۔

اب کمرے کا ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔ مکڑیاں غائب تھیں مگر ان میں سے ایک مکڑی کو تیزی سے پلنگ کے نیچے کی جانب دوڑتے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف لپکی تو وہ بھی غائب ہوگئی۔

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور کرچیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا میں خطرناک استدراجی حملہ کا شکار ہوتے ہوتے بچی تھی۔ حیرت یہ تھی کہ شیشہ ٹوٹنے کی آواز کسی نے نہیں سنی ورنہ چوکیدار خاصا چوکنا شخص تھا۔ ڈرائیور بابا کی نیند بھی کچی تھی، وہ معمولی کھٹکے پر جاگ جاتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے برفانی ہوا کے جھونکوں نے کمرے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ خوف اور ٹھنڈ سے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ جلدی جلدی فرش پر سے کانچ سمیٹے۔ پلنگ کے برابر والی چھوٹی دراز میں

سے بڑا پلاسٹک نکالا اور ٹیپ کی مدد سے کھڑکی پر ٹوٹے ہوئے شیشہ کی جگہ لگا دیا۔

کمرے میں رہ جانے والی مکڑی سے خوف محسوس ہوا۔ رات پریشانی میں کٹ گئی۔ آنکھ بند ہوتی تو ہیبت ناک گدھ کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی۔

ذہن متاثر ہوا تھا۔ شیشہ ٹوٹنے کا واقعہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ ابو ملک سے باہر تھے۔ امی سے کیا کہتی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ ایسے میں چوکیدار اللہ بخش عرف بخشو کی تو ناحق شامت آجاتی۔

صبح میں نے شیشہ پر سے پلاسٹک ہٹا کر کھڑکی کھولی اور ڈرائیور بابا کو آواز دی۔ ان کا کوارٹر میرے کمرے کے پیچھے تھا۔ ان کی آہٹ محسوس ہوئی تو کھڑکی زور سے بند کی، باقی ماندہ شیشہ بھی گر کر بکھر گیا۔ شیشہ کیوں ٹوٹا— اس سوال سے جان چھوٹی!

ڈرائیور بابا دوڑ کر قریب آئے تو میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ کھڑکی بند کرنے سے شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔ ان سے باہر گرنے والے ٹکڑوں کو سمیٹنے کا کہہ کر اندر بکھرنے والے شیشوں کی صفائی خود کی۔

شیشہ ٹوٹنے کے گواہ ڈرائیور بابا تھے۔ رات بھر نیند نہ آنے کی وجہ سے میرا سر بھاری ہو گیا تھا۔ کمرے میں مکڑیوں کی موجودگی کا خیال ذہن سے چپک گیا تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور ذہن نیند قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

باہر نکلی تو امی قرآن کریم کی تلاوت کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی قریب آنے کا اشارہ کیا اور حسب معمول دم کر کے مجھ پر پھونک دیا۔ سکون کی لہریں وجود میں سرایت کر گئیں۔ میں لکڑی کے تخت پر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو پریشان ہو کر بولیں، بیٹا تمہیں تو بخار ہے۔

جی امی طبیعت گڑ بڑ ہے، رات کو نیند نہیں آئی۔ کیا میں آپ کے کمرے میں سو جاؤں؟

ضرور بیٹا لیکن پہلے کچھ کھا لو پھر سو جانا۔

امی سخت نیند آ رہی ہے، اٹھ کر کھا لوں گی۔

اچھا ٹھیک ہے اٹھو۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور میرے ساتھ کمرے میں آگئیں۔ بستر پر لیٹتے ہی وزن بے وزن ہو گیا۔ وہ پاس بیٹھ کر بال سہلانے لگیں اور میں گہری نیند میں چلی گئی۔

دوپہر میں آنکھ کھلی۔ گھر میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ امی کے چہرہ پر خوف اور دہشت کے آثار دیکھے تو میرا دل دہل گیا کہ ماجرا کیا ہے۔

وہ قریب آئیں۔ بیٹا! طبیعت کیسی ہے؟

ٹھیک ہوں امی، گھر میں کیا ہو رہا ہے؟

کچھ نہیں۔ تیاری کرو ہم روما کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے فیومی گیشن والوں کو بلایا ہے۔ نہ جانے کہاں سے چھوٹی چھوٹی مکڑیاں آگئی ہیں۔

مجھے شدید جھٹکا لگا۔مکڑیاں گھر میں کیسے پھیل گئیں۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس کی ذمہ دار میں تھی۔

ڈرائیور بابا اور چوکیدار گھر میں کیڑے مار ادویات ڈالنے والوں کے ساتھ تھے۔گاڑی میں چلا رہی تھی۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا کہ میں کہاں پھنس گئی۔یقیناً ان سب کے پیچھے وہ مکروہ صورت بوڑھا ہے۔مگر یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ کون ہے اور میرا دشمن کیوں بن گیا ہے۔

امی کے چہرہ پر فکرمندی کے آثار میرے لئے شرمندگی کا باعث تھے۔گاڑی میں ٹھنڈک کا احساس ہونے پر ہاتھ ہیٹر کی طرف بڑھایا تو ہاتھ سن ہو گئے — مکڑی ہیٹر کے پاس بیٹھی بے خوف وخطر نوکیلے بازو ہلا رہی تھی۔بھگانے پر بھی آگے پیچھے نہیں ہوئی۔

امی کی نظر پڑی تو ہلکی چیخ نکل گئی۔انہوں نے فوراً روما کو فون کیا۔گاڑی دروازہ پر پہنچی تو چوکیدار نے مستعدی سے گیٹ کھولا۔مگر میں نے گاڑی گھر کے اندر کھڑی کرنے کا ارادہ بدل کر دروازہ سے فاصلہ پر روکی۔امی وجہ سمجھ گئیں۔

گاڑی باہر کھڑی کرنا خلاف معمول تھا۔چوکیدار گیٹ کھولے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔روما دروازہ کھولنے کی آواز سن کر باہر آ گئی تھی۔

امی گاڑی کیوں باہر چھوڑ دی۔لائیں چابی دیں میں اندر کھڑی کروادوں۔روما نے چابی کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔

آپی اسے باہر رہنے دیں بلکہ باہر ہی گاڑی کی اچھی طرح سے صفائی کروادیں۔

وہ بولی، کیوں گاڑی کو کیا ہوا صاف تو ہے۔

آپی وہ اندر مکڑی آ گئی ہے اسے نکلوادیں۔

مکڑیوں کا کیا قصہ ہے امی؟

امی مضطرب ہو کر بولیں، میری تو عقل کام نہیں کر رہی کہ کیا ہو رہا ہے۔گھر میں ایک رات میں اتنی مکڑیاں کہاں سے آ گئیں۔

باتیں کرتے ہوئے ہم لاؤنج میں داخل ہوئے۔روما صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بولی، امی آپ پریشان نہ ہوں گھر میں فیومی گیشن ہو رہی ہے۔

امی بدستور فکرمند تھیں۔وہ سب تو ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ مکڑیاں اتنی تعداد میں کہاں سے آئیں؟

وہ اس افتاد پر خاصی پریشان تھیں۔

پریشانی تو مجھے بھی تھی مگر شرمندگی زیادہ تھی۔

روما نے بتایا کہ اسماعیل بھائی دو دن سے آفس کی مصروفیات کے سبب گھر نہیں آئے لیکن آج آ جائیں گے۔دوسری طرف روما کی ہدایت پر گاڑی کی اچھی طرح سے صفائی کر دی گئی تھی۔چند مکڑیوں کے برآمد ہونے کی اطلاع ملی۔میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ کرے اسماعیل بھائی نے نیلم کا پتہ معلوم کر لیا ہو۔

دو بجے اسماعیل بھائی آ گئے۔مختصر خیریت کے بعد سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔پھر لاؤنج میں آ گئے۔

امی سے بات چیت کے دوران وہ توجہ سے مکڑیوں کی روداد سنتے رہے۔

میں گہری نظروں سے ان کے چہرہ کا جائزہ لے رہی تھی اور محسوس کر چکی تھی کہ وہ امی کو تسلی دینے کے لئے بظاہر اس معاملہ کو سرسری طور پر لے رہے ہیں مگر ان کے چہرہ پر تشویش کے رنگ تھے۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں بات نہ کھل جائے کیوں کہ ابو کا مزاج ایسا تھا کہ وہ خلاف طبیعت یا خلاف معمول بات پر فیصلہ سنانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔

میرے دو شوق تھے۔ پی ایچ ڈی اور روحانی علم۔ پی ایچ ڈی کی اجازت اسماعیل بھائی کی وجہ سے ملی تھی۔ ان کی حمایت سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

امی کی باتیں سننے کے بعد انہوں نے جیب سے پرچہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ پرچہ پر نیلم کے والد کا نام اور گھر کا پتہ درج تھا۔ ساتھ ہی کہا کہ محمود صاحب بہت بیمار ہیں تمہیں جلد نیلم سے ملنا چاہئے۔

موقع اچھا تھا۔ امی گفتگو سن رہی تھیں۔

میں نے فوراً کہا، جی اسماعیل بھائی، آج ہی ملنے جاؤں گی، سیٹلائٹ ٹاؤن زیادہ دور نہیں۔

امی کسمسا کر رہ گئیں۔ لڑکی تم جاؤ گی کس کے ساتھ؟

جواب دینے سے پہلے اسماعیل بھائی نے کہا، خود جائے گی سیٹلائٹ ٹاون دور نہیں اور پتہ بھی آسان ہے۔ رداگر کوئی مشکل ہو تو گوگل میپ سے مدد لے لینا اور ہاں! میری گاڑی لے جانا۔

اسماعیل بھائی نے روما کو اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی کی چابی لا کر دی۔ ان کی گاڑی لے جانے کا سن کر امی مطمئن ہو گئیں۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد امی سے اجازت لے کر آرام کی غرض سے چلے گئے۔

امی اور روما باتیں کرنے لگیں۔ میں نے کچھ دیر ان کا ساتھ دیا پھر اجازت لے کر جانے کی تیاری کی۔ جاتے جاتے چوکیدار کو اپنی گاڑی کی چابی دی کہ اب اسے اندر کھڑی کر دے۔ (قسط: ۴)

برف پوش ریگستان

کولڈ ڈیزرٹ دنیا کا سب سے اونچائی پر واقع ریگستان ہے جو پاکستان کے علاقہ گلگت بلتستان میں واقع ہے۔ اسے کٹپنا ریگستان بھی کہتے ہیں۔ یہ سطح سمندر سے 7303 فٹ بلندی پر ہے۔ یہاں ہواریت کے بڑے ٹیلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ایسے لے جاتی ہے جیسے خانہ بدوش ایک مقام سے دوسرے مقام پر سفر کرتے ہیں۔ کولڈ ڈیزرٹ کی مٹی سفید، دانے دار اور باریک ہے۔ موسم سرما میں ریت برف سے ڈھک جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بے پناہ حسن اور قدرتی وسائل سے نوازا ہے — کولڈ ڈیزرٹ ان میں سے ایک ہے۔

مجتبیٰ حسین

فہم کیا ہے ــــ؟

آدمی ساری عمر خوش فہمی میں رہتا ہے جب کہ خوش فہمی ــــ؟

جب ہم اپنی چالیس سالہ زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ عرصہ خوش فہمی اور غلط فہمی کے بیچ لٹکتے ہوئے پنڈولم کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ یا تو ہم ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رہے یا پھر غلط فہمی کا شکار رہے۔ اسے آپ ہماری کج فہمی کہہ لیں مگر حقیقت یہ ہے کہ فہم و فراست کے معاملہ میں ہمارا ذہن ڈانواں ڈول رہا۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ فرماتے ہیں،

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ خوش فہمی نے جہاں ہمیں کبھی کبھی فائدہ پہنچایا وہیں غلط فہمی ہمارے لئے ہمیشہ نقصان کا باعث بنی۔ خوش فہمی ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ (وہ نعمت جو خلاف توقع ہاتھ آئے) ہے جس کے بل بوتے پر ہم اپنے بل بوتے کو دھوکا دیتے ہیں۔ خوش فہمی نہ ہوتی تو ہم وہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔

اس وقت ایک مشہور ادیب کی بات یاد آرہی ہے جس نے 50 سال تک ادب کی تخلیق کرنے کے بعد ایک دن اپنے دوست سے کہا، 25 سال تک ادب کو تخلیق کرنے کے بعد ایک دن مجھے پتہ چلا کہ مجھ میں ادیب بننے کی صلاحیت نہیں ہے اور یہ کہ اتنے برس میں صرف خوش فہمی میں مبتلا رہا۔

دوست نے پوچھا، اس خوش فہمی کا بھرم کھلنے کے بعد کیا تم نے لکھنا چھوڑ دیا؟

ادیب بولا، نہیں! میں اس وقت ادب سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس وقت تک میں صفِ اوّل کے ادیب کی حیثیت سے خاصا مشہور ہو چکا تھا۔

آپ غور فرمائیں کہ اگر اس ادیب میں خوش فہمی کی صلاحیت نہ ہوتی تو وہ ادیب نہ بنتا۔ سچ پوچھو تو ہمارے ادب میں بہت سے اہلِ قلم کو صرف اس لئے شہرت ملی کہ ان میں صلاحیت کم اور خوش فہمی زیادہ تھی۔

ادب کی بات چھوڑیئے! سماج میں بھی قدم قدم پر خوش فہمی آپ کا ساتھ دیتی ہے۔ نوجوانی کے زمانہ میں ہمیں یہ خوش فہمی تھی کہ ہم بڑے خوبرو نوجوان ہیں۔ حالاں کہ ان دنوں آئینہ بڑی پابندی سے دیکھا کرتے تھے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آئینہ میں ہم وہ نہیں دیکھا

کرتے تھے جو آئینہ ہمیں دکھاتا تھا بلکہ وہ دیکھتے تھے جو خوش فہمی دکھانا چاہتی تھی۔

جب بھی آئینہ دیکھا ہم نظر نہیں آئے بلکہ ہماری خوش فہمی نظر آ گئی۔ گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی خوش فہمی کو سجایا سنوارا کرتے تھے۔ باہر نکلتے تو ہمیں یہ محسوس ہوتا جیسے دنیا بھر کی دوشیزاؤں کی نظریں ہم پر ہیں۔ مانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی دوشیزہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کسی نے ہماری خیریت تک نہیں پوچھی مگر اس کے باوجود اپنے خوبرو ہونے کی خوش فہمی میں مگن رہے اور یہی سوچا کہ ''حسن بے پروا'' کو کسی تعریف یا توصیف کی کیا ضرورت ہے۔

نوجوانی کے چل چلاؤ کا زمانہ آیا تو ہمیں اچانک اپنی خوش فہمی کا احساس ہوا۔ جیسے تیسے بزرگوں نے ہمیں اس خوش فہمی سے باہر کھینچ نکالا۔ ایک جگہ رشتہ کی بات چلائی تو پتہ چلا کہ جس حسینہ سے رشتہ کی بات چل رہی ہے اس کی خوش فہمی بس ابھی شروع ہوئی ہے۔

نوجوانی کی خوش فہمی میں یہی ہوتا ہے کہ لڑکا کسی شہزادی سے اور لڑکی کسی شہزادہ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زمانہ بدل گیا ہے، خوش فہمی شہزادیوں اور شہزادوں کا انتظار کراتی ہے۔

اب یہ جو ہمارے گھر میں خاتون نظر آتی ہیں کسی زمانہ میں اپنی خوش فہمی کے بل بوتے پر خود ساختہ شہزادی بنی ہوئی تھیں۔ آج ہماری بیوی ہیں۔ انہیں تو اب بھی یہ خوش فہمی ہے کہ وہ اصل میں کسی شہزادہ کے لئے پیدا ہوئی تھیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے حصہ میں آ گئیں۔ لہٰذا اب وہ تخت پر بیٹھنے کے بجائے ہمارے گھر میں چٹائی پر بیٹھتی ہیں اور سلطنت کو سنبھالنے کے بجائے امور خانہ داری میں مصروف رہتی ہیں۔

کبھی کبھی بیگم کی خوش فہمی دوبارہ جاگ اٹھتی ہے تو ہم انہیں جتاتے ہیں کہ ہم بھی اصل میں کسی شہزادی کے لئے پیدا ہوئے تھے مگر والدین نے گڑبڑ کر دی ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

ماہ و سال کی گردش نے اب اگرچہ نوجوانی کی خوش فہمی کا بھرم توڑ دیا ہے لیکن ہمیں وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے جب خوش فہمی ہمارے رنگ کو سرخ و سپید بنا دیتی تھی، ہماری بھدی آنکھوں میں ہرنی کی آنکھیں ڈال دیتی تھی اور ہماری چال میں ہنس کی چال کی ملاوٹ کر دیتی تھی۔ اب آئینہ دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے وہ صرف ہماری خوش فہمی تھی لیکن ذرا سوچئے کہ یہ خوش فہمی کتنی انمول تھی اور اس نے کس طرح ہماری انا کو بے جا تسکین پہنچائی تھی۔

اب بھی ہمارے اندر خوش فہمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ چوں کہ فطرتاً نیک آدمی واقع ہوئے ہیں، اس لئے ہماری خوش فہمیاں بھی بڑی بے ضرر ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خوش فہمی یہ ہے کہ سارے دوست ہم پر

جان دیتے ہیں اور وقت آنے پر ہمارے لئے آتشِ نمرود میں بھی کود جانے کو تیار رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب بھی ہم نے کسی دوست سے دس روپے ادھار مانگے تو اس نے ملک کے معاشی نظام پر لمبا چوڑا لیکچر دینا شروع کر دیا۔

اپنی کسمپرسی کا حال مثالوں کے ذریعہ واضح کیا کہ کس طرح منے کے اسکول کی فیس دو مہینے سے ادا نہیں ہوئی ہے۔ اپنی چپل دکھائی کہ دیکھو اس کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ نئی چپل لینا چاہتا ہوں، لے نہیں سکتا۔ تمہاری بھابھی دو مہینوں سے کوئی فلم دیکھنا چاہتی ہیں مگر میں انہیں نہیں لے جا سکتا۔ پھر اپنی جیب سے مونگ پھلی کا لفافہ نکال کر ہماری طرف بڑھا کر کہتے ہیں میں تو دوپہر میں کھانا تک نہیں لے کر آتا، مونگ پھلی پر گزارہ کر رہا ہوں، بھائی لو مونگ پھلی کھا لو۔

اصولاً ایسے وقت میں ہمیں دوستوں کے تعلق سے اپنی خوش فہمی سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہئے لیکن ہم اس خوش فہمی کو بڑے جتن کے ساتھ اپنے اندر سنبھال کر رکھتے ہیں اور دوست کے بیان کو سچ مان لیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس کی مونگ پھلی تک نہیں کھاتے کہ کیوں بیچارے کے پیٹ پر لات ماریں۔

آپ یقین کریں کہ ہمارے آڑے وقت میں آج تک کسی دوست نے ہماری مدد نہیں کی اور ہمیں یہ احساس دلایا کہ خود اس کے سامنے آڑا وقت کھڑا ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ دوست ہی ہمارے لئے سب کچھ ہیں۔

یہ بھی خوش فہمی ہے کہ ہم خاندانی آدمی ہیں۔ ساری اچھی روایات کی پاس داری کا فرض ہم پر عائد ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کوئی دوست ہمارے ہاں مہمان بن کر آتا ہے تو ہم اس کے آگے بچھ جاتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔

بیوی جب میزبانی پر اعتراض کرتی ہے تو ہم اسے اس کے خاندان کا حوالہ دے کر خاموش کر دیتے ہیں کہ تمہارے خاندان پر ایسی روایات کی پاس داری کا فرض عائد نہیں ہوتا لہٰذا اس معاملہ میں خاموش رہو۔ اس خوش فہمی نے ہمیں کتنا رسوا کیا ہے اس کا حال آپ سے کیا بیان کریں۔

ادیب ہونے کے ناطے ہم اور بھی خوش فہمیوں کا شکار ہیں۔ ہمیں یہ خوش فہمی ہے کہ جہاں بھی ہم جاتے ہیں لوگ ہمیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔

ایک بار ادبی محفل میں شرکت کے لئے کسی شہر میں گئے۔ اسٹیشن پر اترے تو اس شہر کے ادبی دوستوں نے ہمیں ہاروں سے لاد دیا۔ ان ہاروں میں ڈوبنے والے تھے کہ کسی نے ہاروں کو ہٹا کر ہمارا چہرہ دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا، بھائیو! جس لیڈر کے استقبال کے لئے ہم آئے ہیں وہ یہ صاحب نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے گلے سے ہار اتار لو اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری خوش فہمی کو گلے میں سے اتارا جانے لگا۔ وہ

ہڑبونگ مچی کہ ہاروں کو گلے میں سے اتارنے کی کوشش میں کوٹ کے دو بٹن ٹوٹ گئے، چہرہ پر پانچ خراشیں آگئیں۔ کچھ بال اکھڑ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم پھر اصلی حالت میں واپس آ گئے۔

یہ سارا کھیل ہماری خوش فہمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر ہم اپنے متعلق خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوتے تو استقبال کرنے والوں کو پہلے ہی بتا دیتے کہ بھائیو! ہم ان کے اہل نہیں، یہ بوجھ ہمارے کندھوں پر نہ ڈالئے۔

دوسری طرف یہ احساس بھی ہوا کہ اگر خوش فہمی نہ ہوتی تو ہم زندگی میں بیک وقت اتنے سارے ہاروں کو پہننے کے تجربہ سے محروم رہ جاتے۔ ایسی ہی خوش فہمی آدمی میں جینے کی امنگ پیدا کرتی ہے۔

سچ پوچھئے تو ہر طرف خوش فہمیوں کا دور دورہ ہے۔ تاجر اس لئے خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ گاہک کو بے وقوف بنا رہا ہے اور گاہک اس خوش فہمی کا شکار ہے کہ اس نے بھاؤ تاؤ کر کے تاجر کو بے وقوف بنایا ہے۔ افسر کی خوش فہمی یہ رہتی ہے کہ ماتحت اس سے بہت خوش ہیں اور ماتحت اس خوش فہمی میں زندگی گزار رہے ہیں کہ وہ اپنے افسر کو بڑی خوش اسلوبی سے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ افراد کی خوش فہمیاں تو ہوتی ہیں، کچھ ممالک بھی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کائنات کا مرکز سمجھتے ہیں۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ خوش فہمی کا بھرم ایک نہ ایک دن ٹوٹ جاتا ہے، آدمی پھر بھی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شاعر دوست زندگی بھر اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ مشاعروں میں ان کا کلام پسند کیا جاتا ہے، حالاں کہ ان کے کلام میں ترنم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لوگ ان کے ترنم کی داد دیتے ہیں تو وہ اسے کلام کی داد سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ اس خوش فہمی میں وہ زندگی بھر مشاعروں میں گانا گاتے رہے۔ ان کا اصلی مقام کچھ اور تھا اور انہوں نے خوش فہمی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو الگ مقام پر لٹکائے رکھا۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں جو بیرون ملک رہتے ہیں۔ جب تک اپنے ملک میں تھے اچھی خاصی باعزت زندگی گزارتے تھے۔ ایک دن نہ جانے جی میں کیا آیا کہ اچھی زندگی کی تلاش میں ملک سے باہر چلے گئے۔ ان کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خیریت سے ہیں اور ایک ہوٹل میں بیرے کا کام کر رہے ہیں۔ ہوٹل کے مالک سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ہر خط میں لکھا ہوتا ہے کہ زندگی میں بڑا عیش و آرام ہے۔ یہاں تو زندگی ہی الگ ہے، یہاں کا سورج الگ ہے، یہاں کا چاند الگ ہے، یہاں کی ندیاں اس طرح نہیں بہتیں جیسے اپنے ملک میں ندیاں بہتی ہیں۔ بڑی شائستہ اور مہذب ندیاں ہیں۔ یہاں کے کوّے اپنے کوّوں کی

طرح منڈیروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں نہیں کرتے۔ مہذب ملک کے کوّے جو ٹھہرے! یہاں کے جانور تک ہر کام وقت پر کرتے ہیں۔ ہمارے جانوروں کی طرح بیٹھے صرف جگالی نہیں کرتے رہتے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے دوست کی خوش فہمی ان سے ایسے لفظ لکھواتی ہے۔

پچھلے دنوں انہوں نے ہمیں بھی مشورہ دیا کہ اپنا ملک چھوڑ کر آجائیں اور وہاں کے جانوروں اور کوّوں کے ساتھ باقی زندگی ہنسی خوشی گزاریں لیکن ہم وہاں جانا نہیں چاہتے کیوں کہ ہماری اپنی کچھ خوش فہمیاں ہیں۔ آدمی سے اس کی خوش فہمیاں چھین لیجئے تو اس کا سانس لینا دوبھر ہو جائے۔

ایک بوڑھا شخص مر رہا تھا۔ بچنے کی امید نہ تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا، لو بھائی! تمہارا آخری وقت آپہنچا۔ آخری خواہش ہو تو بیان کرو۔

مریض بولا، ڈاکٹر صاحب میری آخری خواہش یہ ہے کہ فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا لیں۔

یہ مریض کی خوش فہمی تھی جو جینے کی آرزو بن کر چمک اٹھی۔ اس لئے تو ہم نت نئی خوش فہمیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک خوش فہمی کا بھرم ٹوٹتا ہے تو دوسری خوش فہمی کو اپنا لیتے ہیں۔

تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے
تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں

شیشے سے پیمانے تک

اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں مے خانے تک
تشنہ لبی کا اک دریا ہے شیشے سے پیمانے تک

حسن و عشق کا سوز تعلق سمتوں کا پابند نہیں
اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

راہ طلب کے پیچ و خم کا اندازہ آسان نہیں
اہل خرد کیا چیز ہیں رستہ بھول گئے دیوانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی ہم تک موج نہ آئے گی
پیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے مے خانے تک

مٹی سے جب پھول کھلائے کارِجنوں کی محنت نے
شہر کچھ اس انداز سے پھیلے جا پہنچے ویرانے تک

زخم ہنر کا رنگ سلامت سب کو خبر ہو جائے گی
کتنے چہرے ہم نے تراشے ہاتھ قلم ہو جانے تک

اس غربت کی دھوپ میں شاعرؔ اپنوں کا سایہ بھی نہ تھا
جس غربت کی دھوپ میں ہم کو یاد آئے بیگانے تک

اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں مے خانے تک
تشنہ لبی کا اک دریا ہے شیشے سے پیمانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی ہم تک موج نہ آئے گی
پیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے مے خانے تک

(کلام: شاعرؔ لکھنوی)

آسیہ روبی

یقین کی دنیا

سکون بہت بڑی نعمت ہے جسے حاصل کر کے تم جان لوگی کہ زندگی میں مشکلات اتنی زیادہ نہیں ہوتیں جتنا ہمارا رویہ ان کے ردعمل میں ہوتا ہے۔ ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ حل تک ہم اس وقت پہنچتے ہیں جب پُرسکون ہوں۔ سکون کا راستہ مثبت سوچ ہے۔

وہ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبہ میں بستر پر لاش کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ جسم پٹیوں سے لپٹا ہوا تھا۔ آکسیجن ماسک سے مصنوعی سانس دی جارہی تھی۔ دھڑکنیں ناہموار اور بے ترتیب تھیں۔ گردن پر کالر لگا ہوا تھا— ذہن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''اگلے 48 گھنٹے بے حد اہم ہیں۔ ان کا ہوش میں آنا بے حد ضروری ہے ورنہ یہ کوما میں جاسکتی ہیں۔ ہم کوشش کررہے ہیں۔ آپ دعا کیجئے۔''

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔ حماد کو لگا کہ وہ لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ ٹانگیں بے جان ہورہی تھیں۔ عالیہ اس کی بیوی تھی۔ اسے کھونے کا تصور سوہانِ روح تھا۔

بیٹے کی سالگرہ تھی۔ عالیہ بیکری سے کیک لے کر سڑک پار کررہی تھی کہ بے دھیانی کی وجہ سے تیز رفتار بس نے ٹکر ماری اور وہ اچھلتی ہوئی دور جا گری۔ سر اور کمر پر شدید چوٹیں آئیں۔ ڈاکٹر جان بچانے کی کوشش کررہے تھے۔

عالیہ کی امی گڑگڑاتے ہوئے جانماز بچھائے رب کے حضور بیٹی کی زندگی کی دعا کررہی تھیں۔

میری ماما کہاں ہیں؟ ابھی تک کیک کیوں نہیں لائیں؟ پاپا کہاں چلے گئے؟ سہمے ہوئے عالیان نے اپنی پھوپھو سے پوچھا۔

وہ عالیان کو سینہ سے لگاتے ہوئے بولیں،

بیٹا آپ کی ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پاپا ان کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں۔ اللہ میاں سے دعا کریں وہ جلد ٹھیک ہوجائیں۔ اللہ میاں بچوں کی دعا قبول فرماتے ہیں۔

عالیان اور اس کی پھوپھو دعائیں کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کی دعائیں قبول فرمائیں اور عالیہ کو ہوش آگیا۔ وہ خطرے سے باہر تھی لیکن کم زوری کے سبب جسم کو حرکت نہیں دے سکتی تھی۔

ایک دو روز میں خود سے حرکت کے قابل ہوئی تو

محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں جان نہیں ہے۔ سراسیمہ ہوکر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اسے صدمہ سے بچانے کے لئے تسلی دی اور کہا کہ کچھ دنوں میں ٹھیک ہوجائے گا۔ ہفتہ گزر گیا لیکن پیروں میں حرکت نہیں ہوئی۔ خدشہ یقین میں بدلنے لگا۔

ساتویں روز ڈاکٹر نے اسے بتایا، آپ کی کمر پر گہری چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے نچلا دھڑ مفلوج ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نے یہ نہیں کہا کہ وہ اب کبھی چل نہیں سکتی کیوں کہ ڈاکٹر کا کام مریض کو مایوس نہیں کرنا بلکہ امید دینا ہے۔ ''نچلا دھڑ مفلوج ہوگیا ہے'' کی آواز قہر بن کر ٹوٹی اور وہ سکتہ کی سی کیفیت میں چلی گئی۔

دن گزرتے رہے۔ اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ وہ خاموش ہوگئی تھی۔ حماد کو اسے دوا کھلانے لئے محنت کرنا پڑتی تھی۔ جسمانی طور پر مفلوج ہونے کا غم ناقابل قبول اور گہرا تھا۔ عالیہ کو لگتا تھا کہ جسم کے ساتھ دماغ بھی مفلوج ہوگیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے دوسروں کی محتاج ہوگئی تھی۔ اس طرح کے حادثات کسی بھی شخص کے لئے صدمہ سے کم نہیں ہوتے۔

گھر والے اور عزیز رشتہ دار اس کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں افسوس کرتے تھے مگر ظاہر کرنے کے بجائے امید کی باتیں کرتے اور ہمت بندھاتے۔ لیکن کہاں وہ زندگی سے بھرپور عالیہ، جو ایک منٹ چین سے نہیں بیٹھتی تھی، دوڑ کر سب کام کرتی تھی۔ اور کہاں یہ عالیہ جس کا چہرہ زرد اور زندگی کے احساس سے خالی تھا۔

حماد نے بہت چاہا کہ کسی طرح عالیہ زندگی کی طرف لوٹ آئے مگر غم اور تکلیف کی وجہ سے رویہ میں شدت آگئی تھی۔ وہ بات بے بات چلانے لگتی۔ اس کے چیخنے چلانے اور خودترسی سے گھر کا ماحول ابتر تھا۔ ننھا علیان سہما ہوا رہتا۔ وہ پھوپھو سے کہتا تھا کہ ماما اب پہلے کی طرح مجھ سے پیار نہیں کرتیں اور نہ میری طرف دیکھتی ہیں۔ پھوپھو نے قریب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، جب صحت اچھی ہوجائے گی تو وہ آپ کو پہلے سے زیادہ پیار کریں گی۔ دادی اور پھوپھو نے پہلے سے زیادہ علیان کا خیال رکھا تاکہ گھر کے کشیدہ ماحول سے بچہ کا ذہن متاثر نہ ہو۔

عالیہ کی سہیلی نگہت جو بیرون ملک قیام پذیر تھی، واپس پاکستان آگئی اور رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اسے سہیلی پر گزرے افسوس ناک حادثہ کا علم ہوا۔

عالیہ کی والدہ نے نگہت سے کہا، اسے واپس زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرو۔ بے شک اس کا دکھ بڑا ہے مگر اللہ کی منشا کو قبول کرکے آگے بڑھ جانا سب کے لئے بہتر ہے۔

نگہت سہیلی سے ملی تو عالیہ کی خاموشی کو زبان مل گئی۔ وہ اس سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

''میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیا گناہ کردیا۔ دیکھو! ٹانگیں مفلوج ہوگئیں۔ اب ساری زندگی اس

بستر پر گزرے گی، میں یہ کیسے برداشت کرلوں۔''

تم ایسا کیوں سوچتی ہو کہ ساری زندگی اسی بستر پر گزار دو گی؟ نگہت نے نرمی سے پوچھا۔

تو پھر؟ کیا میں ٹھیک ہوسکتی ہوں۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ شاید میں کبھی چل نہ پاؤں۔

ہاں کیوں نہیں۔ اگر تم چاہو تو ایسا ممکن ہے۔ ارادہ مضبوط ہو تو سب ممکن ہے۔ تمہارا بچہ ہے، شوہر ہے، گھر ہے۔ سب تمہاری توجہ کے منتظر ہیں۔ ایک حادثہ کیا ہوا، تم تو سب کچھ بھلا بیٹھی ہو۔ نگہت نے اسے رسان سے سمجھایا۔

نگہت میں دوسروں کی محتاج ہوگئی ہوں۔ اس حال میں کسی کو کیا سنبھالوں گی۔ گلوگیر لہجہ میں کہا۔

تم بے یقینی کی طاقت پر چل رہی ہو اس لئے بے یقینی تمہیں توڑ رہی ہے۔ یقین کی طاقت استعمال کرو، یہ تمہاری ہمت اور ٹوٹے ہوئے عزم کو جوڑ دے گی۔ ارادہ مضبوط اور حوصلہ بلند ہو تو آسمان بھی سرنگوں ہوجاتا ہے۔ نگہت نے عزم سے کہا۔ جانتی ہو کہ فرد کی قوت ارادی کے سامنے ہر بیماری کم زور ہے۔ ذہن کو مثبت اطلاعات دو۔ تصور میں خود کو چلتا پھرتا دیکھو اور کہو کہ میں صحت مند ہوچکی ہوں۔ اللہ چاہے تو سب ہوجاتا ہے۔ اللہ نے ارادہ میں بہت طاقت رکھی ہے۔

ان باتوں کا حقیقت سے کیا تعلق! وہ مایوس تھی۔

نگہت نے گہرا سانس لیا اور خاموش ہوگئی۔ جب یقین متزلزل ہو تو بحال ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔

پاکستان میں قیام کے دوران اس نے عالیہ کی باقاعدہ کونسلنگ شروع کردی جس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے گھر میں دل چسپی لینا شروع کی۔ اعتماد کی بحالی کے بعد دوسرا مرحلہ عالیہ کو یقین دلانا تھا کہ اگر وہ کوشش کرے تو دوبارہ چل پھر سکتی ہے۔

یہ پُرسکون جگہ تھی۔ وہ جب یہاں آتی، بے حد سکون ملتا تھا۔ یہاں اسے زندگی کا مقصد سمجھ میں آیا۔ یہ نور بابا کا ڈیرہ تھا۔ پہلی بار شفیق ہستی سے ملی تو بے حد مضطرب تھی۔ نور بابا؟ یہ کون ہیں۔ میں ان سے کیوں ملوں؟ تیز آواز میں نگہت سے کہا۔

نگہت نے سمجھایا کہ جو طوفان اپنے اندر دبائے بیٹھی ہو، اس کی طاقت کا کم زور ہونا ضروری ہے ورنہ سب کچھ بہالے جائے گا۔ سکون بہت بڑی نعمت ہے جسے حاصل کرکے تم جان لوگی کہ زندگی میں مشکلات اتنی زیادہ نہیں ہوتیں جتنا ہمارا رویہ ان کے ردعمل میں ہوتا ہے۔ ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ حل تک ہم اس وقت پہنچتے ہیں جب پُرسکون ہوں۔ سکون کا راستہ مثبت سوچ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتی ہوں تم نور بابا سے ملو۔ ان سے مل کر جان لوگی کہ سکون کیا ہے۔

عالیہ کو نرم پڑتا دیکھ کر نگہت نے اصرار کیا کہ ایک بار مل کر تو دیکھو، زندگی بن جائے گی!

نور بابا سے پہلی ملاقات میں مایوسی اور اضطراب دور ہوگئے۔ خیال تھا کہ کوئی عجیب شخصیت ہوگی جو تخت پر بیٹھی ہوگی اور بھانت بھانت کے لوگ ارد گرد جمع ہوں گے لیکن جو سوچا اس کے برعکس پایا۔ وہ سب کے ساتھ عام نشست پر بیٹھے تھے۔ مقناطیسی شخصیت، نرم اور مسکراتا چہرہ۔ ماحول میں سکون کی لہریں تھیں۔

''آدمی سمجھتا ہے کہ وہ با اختیار ہے۔ حقیقت میں اختیار اللہ کا ہے۔ آدمی مجبور محض ہے۔ حالات کے ہاتھوں کھلونے کی مانند ہے۔ وہی ملتا ہے جو قلم نے لکھ لیا ہے اس لئے حالات سے مطابقت پیدا کرنی چاہئے تاکہ بے سکونی ختم ہو۔ اللہ نے کوشش کا حکم دیا ہے۔ تقدیر اس کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے لکھ لیتا ہے۔ اللہ پر کامل یقین ہونا اور اس کی رضا میں راضی رہنا نعمتِ عظیم ہے۔''

نور بابا کی باتیں دل میں اتر گئیں۔

عالیہ باقاعدگی سے یہاں آنے لگی۔

اگر آدمی بے اختیار ہے تو اپنے حالات کیسے بدل سکتا ہے؟ نور بابا سے پوچھا۔

بیٹی! اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صفات پر پیدا کیا ہے۔ خلیفۃ الارض بنایا ہے۔ بے شک آدمی مجبور ہے مگر اللہ نے اس کو ارادہ کی طاقت سے نوازا ہے۔ نیابت عطا ہونا معمولی بات نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کو عطا کردہ بے شمار صلاحیتوں کا انکشاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات فرماں بردار بندوں کے لئے مسخر کردی ہے۔ مسخر کرنے سے مراد ہے کہ انسان اس میں تصرف کرسکتا ہے۔ ارادہ میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ صلاحیتوں کی طرف متوجہ نہ ہوں تو ان کا ہونا ــــ نہ ہونا ہے۔ نوع آدم کے ارتقا پر نظر ڈالو تو بخوبی سمجھ جاؤ گی کہ پہلے آدم غاروں میں رہتا تھا، آج شان دار گھروں میں رہتا ہے۔ اونچی اونچی عمارتیں اور ہوش ربا ترقی یہ سب کیا ہے؟ آدم کے اندر موجود صلاحیتوں کا اظہار ہے۔ جب آدم نے تفکر اور ارادہ کی طاقت سے کام لیا اور عطا کردہ وسائل میں تصرف کیا تو نئی نئی ایجادات سامنے آئیں۔ بندہ کچھ کرنے کا عزم کرلے تو وسائل کی بارش ہوجاتی ہے۔

دھیمے لہجہ میں سمجھانے کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔

عالیہ کے سامنے سوچ کے کئی در وا ہوئے۔

بابا! کیا مجھے وہیل چیئر سے نجات مل سکتی ہے؟

بہت آہستہ سے پوچھا۔

کیوں نہیں۔ کوشش کی جائے تو سب ممکن ہے۔ تم گھر اور بچہ پر توجہ دینا شروع کرو۔ سب کے ساتھ ہنسو بولو، وہ تم سے محبت کرتے ہیں اور تمہیں مایوس دیکھ کر پریشان ہیں۔ نور بابا کی بات سن کر آنکھیں بھر آئیں۔

عالیہ کی سوچ مثبت ہونے سے گھر کا ماحول بدل گیا۔ اب اس نے معذوری کا رونا رونے کے بجائے علاج پر توجہ دی اور فزیوتھراپی بھی ہونے لگی۔

ڈاکٹر نے عالیہ سے کہا، بیش تر واقعات میں امید

ہوتی ہے کہ مریض دوبارہ چلنا شروع کردے۔ضروری ہے کہ مکمل اور باقاعدہ علاج کروایا جائے۔علاج میں تاخیر سے ممکن ہے کہ ٹانگوں کے پٹھے سکڑ جائیں۔اب آپ کو ثابت قدمی سے اپنا مقصد حاصل کرنا ہے۔

عالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فزیوتھراپی اور ورزش آسان نہیں تھی۔کئی ماہ نہ چلنے کی وجہ سے پٹھوں میں لچک نہیں رہی تھی۔علاج کے دو تین ماہ بعد ڈاکٹر نے اسے واکر کے سہارے کھڑے ہونے کو کہا تو ناکامی کے خوف سے ہمت نہیں ہوئی۔

نگہت اور گھر والوں نے حوصلہ دیا۔

عالیہ اٹھنا چاہتی تھی لیکن ٹانگوں نے اس کا بوجھ برداشت نہیں کیا اور وہ واپس کرسی پر گر گئی۔مایوسی کے پہاڑ نے یک لخت ہمت اور خود اعتمادی کو کچل دیا۔

کیسے، کیسے ہوگا یہ سب؟ کہنا آسان ہے مگر کوئی میری جگہ خود کو رکھ کر دیکھے۔وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

کہیں سے نور بابا کی آواز سنائی دی۔

''ہمت اور ارادہ کے آگے کائنات سرنگوں ہے۔''

اسے عالیان اور حماد کا خیال آیا۔اماں اور گھر والوں کی محبت یاد آئی۔سب نے اس کا خیال رکھا اور اس کی ہمت بنے رہے۔وہ اپنوں کو کیسے مایوس کرسکتی تھی۔

باقاعدگی سے ورزش اور مالش سے ٹانگوں میں بہتری آگئی تھی۔بحالی کا سفر کٹھن اور تکلیف دہ تھا جو قدم قدم پر امتحان کی طرح وارد ہوا۔نور بابا نے اللہ پر اس کا یقین بڑھایا کہ یہ سب تمہیں ثابت قدم بنانے کے لئے ہے۔

نور بابا کہتے تھے کہ امتحان ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے جو اللہ نے انسان کو عطا کی ہیں۔

ذہنی اور جسمانی تکالیف سے گزر کر وقت کے ساتھ عالیہ کے اندر ٹھہراؤ پیدا ہوا۔سکون کی لہریں محیط ہونے لگیں۔کوشش جاری تھی البتہ یہ فکر کرنا چھوڑ دی کہ نتیجہ کیا ہوگا۔وہ کہتی تھی کہ نتیجہ جو بھی ہو، مجھے حالات کو قبول کر کے اللہ کی رضا میں راضی رہنا ہے۔

اس ارادہ کے ساتھ اپنے اندر بے پناہ توانائی اور سکون محسوس ہوا۔جیسے وہ بہت بھاری بوجھ سے آزاد ہوگئی ہے۔اس سے پہلے وہ قید میں تھی اور یہ قید کوئی اور نہیں، اس کی اپنی سوچ تھی۔

اس نے نور بابا سے کہا، میں زندگی میں اس موڑ پر آگئی ہوں جہاں حقیقت کھلی ہے کہ آدمی کی سوچ ہی آدمی کی قید بن جاتی ہے۔ہم نے خود اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال دیا ہے اور اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ خوف اور غم سے آزاد ہونا ہے۔

بے یقینی دور ہوئی اور یقین کی روشنی راہ نما بن گئی۔

اس روشنی کے سہارے عالیہ نے طویل عرصہ بعد پہلا قدم اٹھایا۔کمرے میں موجود افراد کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔عالیہ کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ لیکن مضبوطی بھی تھی۔اس نے بے نیازی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا سفر جاری رکھا اور اللہ کے حکم سے صحت یاب ہوگئی۔

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات میں جو کچھ ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور وفکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل ودانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کریں، سوچیں اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیں۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

نونہال دوستو! السلام علیکم،

احمد نے پانی پینے کے لئے گلاس اٹھایا جو ہاتھ سے پھسل کر گر گیا — گھر میں آواز گونجی۔ اماں نے آواز سن کر کمرے سے پکارا، احمد کتنی مرتبہ کہا ہے کہ گلاس دھیان سے پکڑا کرو۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ احمد نے پوچھا، کون ہے؟ آواز آئی، بیٹا میں ہوں۔ وہ خوشی سے بولا، بابا آ گئے۔ بابا نے اسے پیار کیا اور گود میں اٹھالیا۔ احمد اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا کہ غسل خانہ سے ٹپ ٹپ آواز آئی۔ اماں نے کہا، نلکا ٹھیک سے بند نہیں ہوا، ہمیں پانی احتیاط سے استعمال کرنا چاہئے۔

★ آواز سن کر اماں کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ گلاس ٹوٹنے کی آواز ہے؟

★ دستک ہوئی تو کس طرح معلوم ہوا کہ آواز دروازہ سے آئی ہے؟

★ احمد نے دروازہ کھولے بغیر آواز سن کر پہچان لیا کہ یہ اس کے بابا ہیں۔

★ ٹپ ٹپ سے کیسے پتہ چلا کہ آواز پانی کی ہے؟

بچو! ہم اکثر چیزوں کو دیکھے بغیر آواز سے پہچانتے ہیں۔ میاؤں سن کر خرگوش کا تصور نہیں بنتا، بلی کی تصویر ذہن میں بنتی ہے۔ آواز کو سن کر ہم کیسے جان لیتے ہیں کہ یہ آواز کس کی ہے؟

جواب — بچے لکھ کر بھیجیں۔ دادا نانی، نانا دادی، اماں ابا اور بھائی بہن سے مدد لی جاسکتی ہے۔

★ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 20 اکتوبر ہے۔

اگست 2019ء میں بچوں سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ خواب دیکھتے ہیں ـــ خواب میں کیا دیکھتے ہیں؟ کثیر تعداد میں خطوط موصول ہوئے۔ بچوں نے تصویری شکل میں بھی خواب بھیجے۔ منتخب خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔

زویان محسن، جماعت ہفتم (فیصل آباد): آسمان پر اللہ لکھا ہوا ہے اور اللہ کا نام میری کاپی میں لکھا جا رہا ہے۔ پھر آسمان میں رسول اور محمدؐ لکھا ہوا نظر آیا۔ وہی کسی نے میری کاپی میں لکھا۔ اس کے بعد لکھا ہوا نظر آیا کہ جنازہ ادا کرو، نماز پڑھو۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو میری کاپی میں کیا لکھا ہے۔ اس نے کاپی لی، سب کچھ مٹ گیا۔ کاپی واپس لی، تحریر واپس آ گئی۔ اللہ میاں سے میں نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ آسمان پر لکھا ہوا نظر آیا کہ یہ سب کام کرنے ہیں۔ میں نے عمل کرنا شروع کیا۔ کام پورے نہیں ہوئے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔

مصباح الحق، جماعت چہارم (کراچی): میں نے خواب میں خود کو شیر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

نعمان صغیر: ایک خاتون مٹکے میں پانی بھر رہی ہیں۔ پاس گیا اور پانی مانگا۔ انہوں نے مجھے مٹکا دیا اور کہا ـــ جتنا چاہے، پی لو۔ میں نے تھوڑا پانی پی لیا۔ یہ خواب ہر دو تین دن بعد نظر آتا ہے۔

نورالعین، جماعت چہارم (اٹک): ایک بار دادا ابو مرحوم کو دیکھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ جنت میں لے گئے اور سیر کروائی۔ میں دادی اماں کے ساتھ مراقبہ ہال جاتی ہوں اور مراقبہ کرتی ہوں۔

نورعجم، جماعت پنجم: خواب دیکھا کہ ٹرین میں کراچی جا رہا ہوں۔ وہاں قلندر باباؒ کے مزار پر آدھا گھنٹا مراقبہ کیا۔

حورین، جماعت چہارم (کراچی): دریا میں ہیرا ہے جس میں سے روشنی نکل رہی ہے۔

شفیع، جماعت پنجم: سمندر میں بارش ہو رہی ہے اور اس میں میرا نام لکھا ہوا ہے۔

فرحین، جماعت ہفتم: میں اور خالہ جہاز میں مدینہ منورہ جا رہے ہیں اور مسجد نبویؐ میں نعتیں پڑھ رہے ہیں۔

اریبہ محسن، جماعت نہم (فیصل آباد): خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ ان کے گرد روشنی کا ہالہ ہے، چیزیں ہوا میں اڑ رہی ہیں اور میں انہیں دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ وہ مجھ سے فرماتے ہیں مراقبہ سے ہماری راہ نمائی ہوتی ہے۔

احمد (کراچی): پودوں کو پانی دے رہا ہوں۔ **آدرش، جماعت ہفتم (کراچی):** دیکھا کہ حج پر گئی ہوں۔

تنزیلہ محمد عامر، جماعت دوئم (کراچی): اکثر خواب میں خانہ کعبہ دیکھتی ہوں۔

عبدالرحمٰن انجم، جماعت ہفتم (فیصل آباد): گھر والوں کے ساتھ گاڑی میں گیا اور خانہ کعبہ کی زیارت کی۔ دوسرے خواب میں دیکھا کہ میں نے گاڑی خود چلائی۔

باادب بانصیب

رات کو بچے دادا ابو کے ارد گرد بیٹھے کہانی سننے کے منتظر تھے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ سرد ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں — صحن میں آگ جل رہی تھی اور بچے دادا ابو کے گرد ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے شمع کے گرد پروانے — آنکھوں میں چمک اور جستجو تھی کہ آج دادا ابو کون سی کہانی سنائیں گے۔

صبر نہ ہوسکا تو بے تابی سے کہا، دادا ابو! آج پرستان کی کہانی سنائیں گے یا جنات کی دنیا کی؟

دادا ابو نے کہا، آج میں اپنی کہانی سناؤں گا۔

بچوں نے دیکھا کہ دادا ابو کی آنکھیں صحن میں جلنے والی آگ پر جمی ہوئی تھیں مگر وہ آگ کو نہیں، دور کہیں اور دیکھ رہے تھے۔

جب میں تمہاری عمر کا تھا تو ناشتہ میں آٹے اور گڑ سے بنا میٹھا حلوہ شوق سے کھاتا تھا۔ اماں دیسی گھی میں حلوہ بناتی تھیں تاکہ میری ہڈیاں مضبوط ہوں اور میں صحت مند رہوں۔ یہ کہتے ہوئے دادا ابو کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

سب سے قریب بیٹھے پوتے نے آنسو صاف کئے اور رونے کی وجہ پوچھی؟ وہ ہنس دیئے اور بولے، جب اماں یاد آتی ہیں تو آنکھیں پانی سے بھر جاتی ہیں۔ کیا تم اپنی اماں کے لئے نہیں روتے؟

بچوں نے کھلکھلاتے ہوئے کہا، دادا ابو! ہم بچے ہیں اور آپ بڑے ہوگئے ہیں۔

دادا نے شرارت سے کہا، ٹھیک ہے پر اپنی اماں کے لئے میں آج بھی بچہ ہوں۔

بچوں نے یہ سنا تو مسکرائے اور دادا سے لگ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے سینہ پر سر رکھا، تو کوئی ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

انہوں نے گہرا سانس لیا اور بتایا، جب میں بارہ سال کا تھا تو اماں کا انتقال ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد ابا بیمار ہوگئے۔ میں کم عمری میں گھر کے سارے کام کرنا سیکھ گیا تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا، گاؤں کے اسکول میں داخلہ ہوا۔ میرے ٹیچر گھر کے حالات جانتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ محنت کرو گے تو اسکول کی فیس معاف ہوجائے گی۔ میرے ساتھ زمیندار کا لڑکا بھی اسکول میں داخل ہوا۔ ہم دونوں

کا اسکول میں پہلا دن تھا، کلاس میں ساتھ بیٹھے اور ہماری دوستی ہوگئی۔ سب کہتے تھے کہ غریب لڑکے کی امیر لڑکے سے دوستی کیسے ہوسکتی ہے۔ خیال درست تھا۔۔۔ وہ دوستی نہیں تھی۔

زمیندار کے بیٹے کو پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ وہ انتہائی سست تھا۔ سست کیوں نہ ہوتا، اس کے ساتھ ملازم ہوتا تھا جو سارے کام کرکے دیتا جب کہ اس کے اسکول کا کام میں کرتا تھا۔ زمیندار صاحب کو بیٹے کی پڑھائی کی فکر نہیں تھی۔

ایک روز میں نے کہا، دوست! اگر تم کلاس میں دل چسپی اور توجہ سے سبق سنو تو تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر تمہارا ہوم ورک میں کرتا رہا تو امتحان میں کام یاب کیسے ہوگے؟

میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے لاپروائی اور غرور سے کہا، کام یابی کیا ہوتی ہے۔۔۔؟ دو ٹکے کی نوکری کو تم کام یابی کہتے ہو؟ مجھے کسی کی نوکری کی کیا ضرورت ہے، میرے آگے پیچھے نوکر گھومتے ہیں۔ تم میری نہیں، اپنی فکر کرو۔

میں نے بات ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا کہ پھر پڑھنے کے لئے بھی نوکروں کو بھیج دیا کرو۔۔۔ اس بہانے ان کا بھلا ہوجائے گا۔ یہ کہنا تھا کہ وہ مجھے مارنے کے لئے دوڑا لیکن وہ موٹا تھا، بھاگتے ہوئے ہانپنے لگا اور میں گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر احساس ہوا کہ کاش میں بھی امیر باپ کا بیٹا ہوتا۔

اس کے رویہ سے تکلیف پہنچی اور احساس کم تری پیدا ہوئی کہ میرے پاس دولت نہیں ہے۔ اسی سوچ میں آنکھ لگ گئی اور میں نے دیکھا،

کسی بزرگ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا، بیٹا! کیوں اداس ہوتے ہو؟ تم نہیں جانتے کہ اللہ کے محبوب حضور اکرمؐ اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند فرماتے تھے اور تم بھی تو امیر ہو۔ اللہ نے تمہیں بھی ملازم دیئے ہیں۔

حیرانی سے پوچھا، میرے ملازم؟ کہاں ہیں؟

انہوں نے فرمایا، تمہارے ساتھ ہیں۔ دیکھو تمہارے ہاتھ، پیر، ناک، کان۔۔۔ ان سے تم جو کام لینا چاہتے ہو، لے لیتے ہو۔ کبھی ایسا ہوا کہ انہوں نے کام کرنے سے انکار کیا ہو؟ پیروں کو جہاں چلنے کا کہو، اس طرف چل پڑتے ہیں، جو چیز اٹھانا چاہو، ہاتھ تعمیل کرتے ہیں۔ یہ تمہاری نافرمانی نہیں کرتے مگر وہ نوکر جسے تم تنخواہ دیتے ہو، حکم ماننے سے انکار کرسکتا ہے اور کام چھوڑ کر بھی جاسکتا ہے۔ کون سا ملازم بہتر ہوا۔۔۔ چھوڑ کر جانے والا یا وہ

جو مرتے دم تک ساتھ رہے؟

دادا ابو نے بچوں سے پوچھا، بتاؤ میں نے کیا جواب دیا ہوگا؟

بچے بولے، ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔

بالکل! اہمیت حکم ماننے والے کی ہوتی ہے۔ میں نے بھی بزرگ سے یہی کہا تھا۔ اپنا کام دوسروں سے کروانے والوں کی مثال کٹھ پتلی کی ہے جسے کھیت میں کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ کوّے اور چڑیاں اس سے ڈریں۔ ایک وقت کے بعد کوّے اس پر بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں، چڑیاں ڈرتی نہیں اور بے خوفی سے دانہ چگتی ہیں۔

بزرگ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اوروں پر انحصار کرنے والے لوگ دوسروں کے غلام بن جاتے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے غلام ہیں۔

دادا ابو پھر کیا ہوا؟

پھر منظر بدلا۔ ہم کھیت میں تھے۔ قریب چڑیوں کا گھونسلا تھا۔ بزرگ نے فرمایا، غور سے سنو! چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں؟ میں نے کہا، میں ان کی زبان نہیں جانتا۔ بزرگ نے پرزور لہجہ میں فرمایا، تم ان کی زبان جانتے ہو — غور سے سنو۔

بے یقینی سے بزرگ کو دیکھا اور گھونسلے کی طرف توجہ مرکوز کر لی۔ تھوڑی دیر بعد چڑیوں کی چوں چوں سمجھ میں آنے لگی۔ ایک چڑیا بچوں سے کہہ رہی تھی کہ فصل پک گئی ہے، کٹائی کا کام شروع ہو جائے گا اور ہمیں یہاں سے جانا پڑے گا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کھیت کا مالک آئے تو وہ ملازموں کو فصل کی کٹائی کا دن بتائے گا۔ غور سے سننا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ یہ کہہ کر چڑیا اڑ گئی۔

کھیت کا مالک آیا اور درخت کی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھ گیا پھر ملازم کسانوں کو کہا کہ فصل تیار ہے۔ کل سے کٹائی شروع کرنی ہے۔ ملازم کم ہیں اس لئے آس پاس سے لوگ جمع کر لینا۔

گھونسلے میں بچے ڈر گئے۔ اماں واپس آئیں تو انہیں ایک سانس میں بتایا کہ کل سے کٹائی ہے۔ چڑیا نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجہ میں کہا، ڈرنے کی بات نہیں، فصل کئی دنوں تک نہیں کٹے گی۔

شام ڈھل کر رات ہوئی اور رات صبح میں تبدیل ہوگئی۔ گاؤں میں سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اس لئے ملازم نے آس پاس رہنے والوں سے مدد مانگی مگر حیران کن طور پر کوئی نہیں آیا۔ اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ کھیت کے مالک نے رشتہ داروں کو پیغام بھجوایا۔ اگلے روز ایک رشتہ دار

کے علاوہ کوئی فصل کی کٹائی کے لئے نہیں آیا۔

اس طرح ہفتہ گزر گیا۔

چڑیا روز بچوں کو گھونسلے میں چھوڑ کر نہیں معلوم کہاں جاتی تھی۔ایک روز بچوں نے بتایا،

اماں ـــ کھیت کا مالک آج اپنے بچوں کے ساتھ آیا تھا اوران سے کہہ رہا تھا کہ لوگوں پر بھروسا کر کے بیٹھ گئے تو کٹائی کا کام کبھی نہیں ہوگا، پوری فصل خراب ہو جائے گی۔الحمدللہ، ہمارے ہاتھ پیر سلامت ہیں،کل یہ کام ہم خود شروع کریں گے۔

چڑیا اماں نے یہ سنا تو کہا،بس بچو یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔کل فصل کی کٹائی کا کام شروع ہو جائے گا۔ چڑیا کے بچے بولے، یہ بات تو کھیت کا مالک کئی روز سے کہہ رہا ہے۔

چڑیا بولی،کل کام شروع ہو جائے گا کیوں کہ آج کھیت کے مالک نے اللہ کے بھروسے پر خود کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔کل تک یہ لوگوں پر انحصار کر رہا تھا۔اب فصل وقت پر کٹ جائے گی۔ یہ کہہ کر چڑیا بچوں سمیت گھونسلے سے اڑ گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔

بچوں نے دادا ابو سے پوچھا،اورآپ کے اسکول والے دوست کا کیا بنا؟

وہ ـــ جوانی میں مر گیا۔ ہلتا جلتا نہیں تھا۔ ہر کام کرنے کے لئے نوکر موجود تھے ۔ وزن اتنا زیادہ ہو گیا کہ ٹانگوں کے لئے بوجھ اٹھانا مشکل تھا۔ بیٹھے رہنے سے مزید بیمار رہنے لگا۔ ملازم اٹھاتے تھے، بٹھاتے تھے۔وہ اللہ سے دعا کرتا تھا کہ مجھے پھرتیلا اور صحت مند بنا دے اور کبھی دولت کو برا بھلا کہتا۔

بچو! دولت بری نہیں ہے،استعمال غلط کیا گیا۔

دادا ابو نے دیکھا کہ ان کے پوتے پوتیاں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

صبح سب اسکول جانے کے لئے اٹھے تو بستر خود ٹھیک کیا، چادر تہ کی۔ ہر روز اپنے چھوٹے چھوٹے کام خود کرنے لگے اور اماں کی بھی مدد کرتے تھے۔ وقت پر اسکول جاتے تھے ۔ بڑا بھائی اپنے اور چھوٹے بہن بھائیوں کے کپڑے استری کرتا اور اگر اماں ناشتہ بنانے میں مصروف ہوتیں تو وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو اسکول کے لئے تیار کر لیتا تھا۔ استاد کی توجہ اور ماں باپ کی دعاؤں سے امتحان میں سب بچے کامیاب ہوئے۔

بچو! ہمارے دادا مرشد قلندر باباؒ نے فرمایا ہے:

با ادب بانصیب ، بے ادب بے نصیب

بچو! آپ کیا سمجھے ــــ؟

صفیہ حساس لڑکی تھی۔ کم گو ہونے کی وجہ سے لوگوں سے میل جول نہ ہونے کے برابر تھا اور کسی سے دوستی بھی نہیں تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ اور خاموش رہتی تھی۔ اسکول میں جس لڑکی سے دوستی ہوئی اس نے کچھ عرصہ بعد دوسرے اسکول میں داخلہ لے لیا جس سے صفیہ پریشان ہوگئی۔

بابا نے پریشانی کی وجہ پوچھی۔

صفیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اسے ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتے تھے اور جانتے تھے کہ اسکول میں اس کی کسی سے دوستی نہیں ہے۔

بابا! میری ایک ہی دوست تھی جس کا داخلہ دوسرے اسکول میں ہوگیا ہے۔ وہ میری مدد کرتی تھی اور ہم دونوں ایک ساتھ اچھا وقت گزارتے تھے۔ میرا کوئی دوست نہیں۔

بابا نے کہا، پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ کلاس میں دوسرے بچوں سے بات کیا کرو، ان کے ساتھ کھیلو، اور جو سمجھ میں نہیں آتا ٹیچر سے پوچھو۔ پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھو۔ اور دوست تو تب بنیں گے جب تم دوست بنانے کی کوشش کرو گی۔ الگ تھلگ بیٹھنے سے دوست نہیں بنتے۔

صفیہ نے اکتاہٹ سے کہا، بابا! آپ جانتے ہیں میں ہر ایک سے گھل مل نہیں سکتی۔

بیٹا! دوستی ہر ایک سے نہیں ہوتی مگر سلام دعا سب سے ہونی چاہئے۔ ان میں کوئی اچھا دوست مل جاتا ہے۔ تم کوشش تو کرو۔

بیٹی کو خاموش دیکھ کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا، باورچی خانہ میں آؤ، تمہارے مسئلہ کا حل وہاں ہے۔ دونوں باورچی خانہ کی طرف آئے۔

بابا نے تین برتنوں میں پانی بھرا، چولہے پر رکھا اور آگ جلائی۔ پانی میں بلبلے بننے لگے، بھاپ نکلنا شروع ہوئی۔ پانی زیادہ گرم ہوا تو پانی میں ابال آیا۔ انہوں نے ایک برتن میں آلو، دوسرے میں انڈا اور تیسرے میں چائے بنانے کے لئے پتّی ڈالی۔ اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

بیٹی نے کہا، بابا آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے انڈا کھانا ہے نہ آلو اور چائے ہم نے ابھی پی ہے۔

بیٹا! صبر سے انتظار کرو اور دیکھو کیا ہوتا ہے۔

وہ بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد انہوں نے چولہا بند کیا۔ پہلے انڈا نکالا پھر آلو کو الگ پلیٹ میں رکھا اور آخر میں چائے کپ میں ڈالی جس کی خوش بو باورچی خانہ میں پھیل گئی۔

صفیہ بیٹا! تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟

اس نے کہا، آلو، انڈا اور چائے۔

غور سے دیکھو۔ انہوں نے آلو کو انگلی سے دبایا۔

صفیہ نے دیکھا کہ آلو نرم ہوگئے تھے اور آلو کے جس حصہ پر انگلی سے دباؤ ڈالا تھا، وہ حصہ اندر کی جانب چلا گیا۔

بابا نے کہا، اب انڈا کھولو۔ صفیہ نے انڈے کا چھلکا اتارا تو وہ ابلنے سے سخت ہوگیا تھا۔

آخر میں چائے کا گھونٹ لینے کو کہا۔ دودھ پتّی کی خوش بو سے اس کے چہرہ پر تناؤ کم ہوا۔

اس نے پوچھا، ان سب کا کیا مقصد ہے، آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں؟

بابا نے صفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور شفقت سے کہا، بھئی آسان سی بات ہے۔ آلو، انڈے اور چائے کی پتّی کا سامنا ایک طرح کے حالات سے ہوا — یعنی تینوں کو گرم ابلتے ہوئے پانی میں ڈالا گیا لیکن تینوں کا ردعمل مختلف ہے۔

۱۔ آلو سخت تھا۔ جس طرح انڈوں کو آسانی سے توڑا جاسکتا ہے، آلو کو ان کی سختی کی وجہ سے نہیں توڑا جاسکتا۔ آلو جب ابلتے ہوئے پانی میں ڈالا تو کم زور پڑ گیا اور اتنا نرم ہوگیا کہ اسے آسانی سے الگ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اب آتے ہیں انڈے کی طرف۔ انڈا نازک ہوتا ہے۔ انڈے کے باہر کا خول اندر موجود زردی اور سفیدی کی حفاظت کرتا ہے۔ انڈے کو جب گرم پانی میں ڈالا تو باہر خول اندر کی حفاظت نہیں کرسکا۔ گرمی اندر تک چلی گئی اور وہ اندر باہر سے سخت ہوگیا۔

۳۔ رہ گئی چائے! چائے کی پتّی پانی میں ڈالی تو چائے نے وہ کیا جو کسی نے نہیں کیا۔ اس نے پانی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا — پانی کا رنگ بدل دیا اور ماحول میں اپنی خوش بو پھیلا دی۔

کیا بات تمہاری سمجھ میں آگئی؟

نہیں بابا! بھلا چائے، انڈے اور آلو سے میرا کیا تعلق ہے!

بیٹا! ہر چیز صرف کھانے پینے کے لئے نہیں ہوتی،

غور کرنا چاہئے کہ ہم کیا کھا رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری نشانیوں پر غور کرو لیکن ہم فائدہ تلاش کرتے ہیں۔ اس سے آگے ہماری سوچ نہیں جاتی۔

صفیہ شرمندہ ہوئی اور بابا سے کہا، بتائیے کہ یہ سب چیزیں ہمیں کیا سکھاتی ہیں۔

بابا پُرجوش لہجہ میں بولے، یہ ہوئی نہ بات! دیکھو چائے کی پتّی کو ہم نے کھولتے ہوئے پانی میں ڈالا۔ کھولتے ہوئے پانی کی مثال مصیبت کی ہے۔ پتّی کو مصیبت کا سامنا ہوا تو اس نے مصیبت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ اس انداز میں مقابلہ کیا کہ مصیبت کا رنگ اڑ گیا اور وہ پتّی کے رنگ میں ڈھل گئی۔ اب کوئی اسے پانی نہیں کہے گا، سب کہیں گے کہ چائے ہے۔

آلو کی مثال بتاتی ہے کہ بندہ کو اتنا کم زور نہیں ہونا چاہئے کہ مشکل حالات کے آگے جھک جائے جیسے آلو گرم پانی میں گیا اور نرم ہو گیا۔ مشکل حالات سے گھبرانا اچھی بات نہیں۔

رہ گیا انڈا۔ انڈے نے بھی گرم پانی کے اثر کو قبول کر کے خود کو اندر باہر سے سخت کر لیا۔ سخت شے آرام سے ٹوٹ جاتی ہے۔ ہمیں کسی سے مقابلہ

کیا پریاں چاند میں رہتی ہیں ــــ؟

دادی اماں کہتی ہیں
چاند میں پریاں رہتی ہیں
رات کو پر پھیلاتی ہیں
اور اتر کر آتی ہیں
سب بچوں کو سلاتی ہیں
اور پھر خواب دکھاتی ہیں
دادی اماں کہتی ہیں
چاند میں پریاں رہتی ہیں
میں تو آج نہ سوؤں گا
رات گئے تک جاگوں گا
باہر باغ میں بیٹھوں گا
چاند کی پریاں دیکھوں گا
دادی اماں کہتی ہیں
چاند میں پریاں رہتی ہیں

نہیں کرنا بلکہ اچھی شے کو قبول کرنا ہے اور مشکل حالات کو خود پر حاوی کرنے کے بجائے ان پر غالب ہو جانا ہے۔

بچو! آپ کی سمجھ میں کیا آیا ــــ؟

خواب تعبیر اور مشورہ

بڑے پیر صاحبؒ کا گھر

ا،ب، چینوٹ۔ایسا لگا کہ بڑے پیر صاحب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے گھر میں موجود ہوں، وہاں اسٹیج تیار کیا جارہا ہے جہاں آقا و مولا رسول عربی حضرت محمد مصطفیٰؐ تشریف لائیں گے۔ میرے والد محترم مہمانوں کے لئے کرسیاں لگا رہے ہیں۔ میں ابو سے کہتی ہوں کہ مجھے آگے کی کرسی چاہئے تاکہ حضور اکرمؐ کا دیدار کرسکوں۔ والد صاحب کہتے ہیں یہ اگلی صف تمہارے لئے ہے۔ اتنے میں مرشد کریم تشریف لائے اور مجھے دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہتے ہیں اور بائیں طرف والی کرسی خالی ہے۔ اس اثنا میں ایک سفید روشن ہاتھ میرے سر کے اوپر آجاتا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ خواب سن کر سعادت نصیب ہوئی۔ اس خواب میں اللہ کے محبوب ہم سب کے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر سعادت اور خوش بختی ہے۔ درود شریف کی فضیلت آپ کو مبارک ہو۔ درود شریف کا ورد جاری رکھیں۔ دن میں گفتگو کے درمیان الفاظ کا انتخاب کبھی اچھا نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ کے محبوب دوست ولی اللہ ارشاد فرماتے ہیں، احتیاط کا تقاضا ہے کہ درود شریف رات کو یک سو ہوکر پڑھا جائے۔

اللہ کے محبوب رسول اللہؐ کا ارشاد ہے، جب بندہ مجھے درود و سلام بھیجتا ہے تو وہ مجھے ملتا ہے۔

احتیاط کا تقاضا ہے نہا دھوکر یا وضو کر کے اچھا لباس زیب تن کیا جائے، اچھی خوش بو کا اہتمام اور صفائی کا خاص خیال رکھا جائے تو سعادت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ آپ کا احرام ہے

عزیزہ بیگم، کورنگی۔ ایک بزرگ تشریف لائے جن کا چہرہ نہیں دیکھ سکی لیکن ہاتھ پیر بہت گورے گورے اور پتلے ہیں۔ بزرگ کے ہاتھ میں لفافہ ہے جس پر میرے شوہر کا نام لکھا ہے۔ بزرگ نے شوہر کا نام لے کر پوچھا آپ ہیں؟ تو شوہر نے جی ہاں میں جواب دیا۔ انہوں نے لفافہ شوہر کو دیا کہ یہ ٹکٹ اور ویزا ہے پھر دو چادریں دے کر فرمایا یہ آپ کا احرام ہے۔ شوہر نے کہا، میں بہت کم زور اور لاغر ہوں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بزرگ نے کہا کہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہوگی، جب آپ طوافِ کعبہ کریں گے تو ٹھیک

ہو جائیں گے۔ پھر فرمایا، آپ کو فوراً روانہ ہونا ہے میں پورا انتظام کر کے آیا ہوں۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوبؐ کی رحمتیں آپ پر ہوں۔ خواب کی تعبیر نہایت نور علیٰ نور ہے۔ انشاء اللہ خواب میں جو دیکھا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اللہ کے گھر اور حضور پاکؐ کے روضۂ اقدس پر حاضری ہو تو مجھ عاجز بندہ عظیمی کو یاد رکھئے۔ خواب پڑھ کر الحمدللہ دل خوشی سے معمور ہوگیا۔ درود شریف پڑھنے کی بہت فضیلت ہے، اسے جاری رکھئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے، آمین۔

ہاتھی بیل اور گھوڑا

شگفتہ رشید، ناظم آباد۔ ہاتھی، بیل اور گھوڑا موجود ہیں۔ مجھے پتہ نہیں چلا کہ کب اور کیسے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ وہاں امی اور ساس بیٹھی ہیں جن سے مخاطب ہو کر گھوڑا بولا، تم نے شگفتہ کے ساتھ جو زیادتی کی اس کا معاوضہ دینا ہے۔ امی اور ساس دیکھتی رہ گئیں حالاں کہ میرے خیال میں تو کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔

تعبیر: خواب کی اجتماعی تعبیر یہ ہے کہ جب کوئی غیبت کرتا ہے تو جس کی غیبت کی جا رہی ہے اس کا خون پیتا ہے۔ بزرگ کو ایک خواب سنایا کہ کسی شخص کی شہادت کی انگلی کے پہلے پور سے مسلسل خون بہ رہا ہے۔ انگلی دوسرے شخص کے منہ میں ہے۔ تیزی سے منہ میں خون بھر گیا۔ بظاہر یہ خیال آتا رہا کہ صاحبِ خواب خون پی رہا ہے۔ شدید ردعمل میں غیبت کرنے والے کا منہ بند ہے اور انگلی میں سے خون بہہ کر منہ میں بھر رہا ہے۔ وہ خون تھوکنا چاہتا ہے لیکن منہ نہیں کھلتا یہاں تک کہ ہونٹوں میں سے خون رس رہا ہے۔ انتہائی دہشت میں منہ کھولا تو ایسا لگا کہ منہ سیل بند ہے۔ اس کشمکش میں آنکھ کھل گئی۔ اس قدر دہشت طاری تھی کہ دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی اور جسم سن ہوتا محسوس ہوا — ایک بزرگ کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا۔ بزرگ فجر کی نماز کے بعد وظائف میں مشغول تھے۔ انتظار کیا اور سلام عرض کر کے گھبراہٹ اور انتہائی درجہ پریشانی میں خواب سنایا۔ بزرگ نے فرمایا، تم غیبت کرتے ہو اور جو بندہ غیبت کرتا ہے وہ ایسا عمل ہے جیسے جس کی غیبت کی جا رہی ہے اس کا خون پی رہا ہے۔ عاجزی و ندامت سے اللہ کے حضور دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ اب غیبت نہیں کروں گا۔ الحمدللہ سکون ملا۔

سونے کی افشاں

کاملہ، کراچی۔ میں سانگھڑ گئی ہوں۔ کسی نے بھینسوں کا تازہ دودھ دے کر کہا کہ کھیر بنالو۔ پھر ایک تھالی میں بہت ساری عجوہ اور مبروم کھجور بھی دی کہ انہیں بھی کھیر میں ڈالو۔ اس کے بعد کھویا لا کر دیا۔ کھوئے کے اوپر سونے کی افشاں اور چمک پڑی ہوئی ہے۔ میں نے تھوڑا سا کھویا لے کر کھیر میں ڈال دیا کہ کھیر اچھی بن جائے گی۔

تعبیر: کچن کا کام کرنا ایک اچھی مصروفیت ہے جب کوئی بات بار بار ذہن دہراتا ہے تو ذہن پر نقوش گہرے ہوجاتے ہیں۔ وہ خیالات آدمی خواب میں دہراتا ہے۔

محفلِ میلاد

دعا اقبال، سرجانی۔ میں نے گھر میں بچوں کی میلاد کی محفل رکھی۔ اس محفل سے ایک دن پہلے خواب دیکھا کہ گھر میں خوب گہما گہمی ہے۔ سوچتی ہوں کہ دونوں کمروں میں سے جو بڑا ہے اس میں لوگوں کو بٹھاؤں گی۔ کچھ رشتہ دار تقریب کی فلم بنانے کی تیاری میں مشغول ہیں اور مجھے بتایا کہ اس سے پروگرام اور بہتر ہوجائے گا۔ خیال آیا کہ ایک دن پہلے مہندی لگاؤں گی۔ میں نے کافی لوگوں کو دعوت دی مگر سوچتی ہوں کہ میرے اتنے وسائل تو ہیں نہیں یہ سب کیسے ہوگا؟ پھر میلاد شریف کی محفل شروع ہوئی۔ ایک خاتون نے پوچھا کہ میلاد کون پڑھے گا۔ کسی نے کہا، ایک پرانی پڑھنے والی ہیں وہ پڑھیں گی۔ میں نے بتایا کہ میری بہن میلاد پڑھیں گی۔

تعبیر: ماشاءاللہ خواب مبارک ہے۔ حضور پاکؐ پر جب درود پڑھا جاتا ہے، درود شریف حضورؐ تک پہنچتا ہے۔ درود شریف پڑھنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والوں تم بھی میرے محبوبؐ پر درود وسلام پڑھو۔ درود شریف پڑھنے کی محفل منعقد کرنا بہت سعید عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جغرافیائی شکلیں

نام شائع نہ کریں، کورنگی۔ ایک گرجا گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔ پھر دیکھا کہ اس کے اندر ہوں۔ وہاں الہامی کتاب رکھی ہے۔ ایک خاتون اس کتاب کو کھول کر میرے سامنے ادب سے رکھ کر کہتی ہیں کہ پڑھئے۔ پہلے صفحہ پر مائع کی طرح جغرافیائی اشکال تھیں۔ دوسرے صفحہ پر مزارات نظر آئے۔ اس سے پہلے میں نے خوابوں میں گرجا گھر صرف باہر سے دیکھے ہیں۔

تعبیر: آپ کے لاشعور نے متنبہ کیا ہے کہ دین کے معاملہ میں احتیاط کریں۔ طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم ترجمہ کے ساتھ پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں کہ وہ آپ کو صراط مستقیم پر قائم رکھے، آمین۔

ایک سائل، میر پور خاص۔ تعبیر: آپ کے خواب میں ناآسودہ خواہشات کی تصویریں ہیں۔

شیشہ کا گھر

نبیلہ تبسم، کراچی۔ والد صاحب تیزی کے ساتھ مجھے ایک بزرگ کے پاس لے کر جارہے ہیں۔ کہتی ہوں کہ ابھی تو رات ہے۔ وہ فرماتے ہیں، جاتے جاتے صبح

ہوجائے گی۔ ان کی رفتار میں کمی نہیں آتی اور راستہ میں کچھ کتّوں نے حملہ کیا جن سے مجھے بچاتے ہیں۔ جب ہم بزرگ کے دربار میں پہنچتے ہیں تو اللہ کے دوست ایک شیشہ کے گھر میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ہمیں دیکھ کر باہر تشریف لائے۔ میں کہتی ہوں، السلام علیکم بابا جان۔ بزرگ جواب دے کر سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے سے آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں سے محبت نہیں فرماتے (اعراف: ۳۱)۔ گھر میں فضول خرچی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسراف کو پسند نہیں فرماتے۔ اخراجات میں توازن پیدا کریں، گھر کے خرچہ کا بجٹ بنائیں اور غور کریں کہ فضول خرچی کہاں ہوتی ہے۔ جو ہوتی ہے، احتیاط کیجئے، انشاء اللہ گھر میں برکت ہوگی۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم پڑھئے۔ خواب میں ضد اور غصہ کے نقوش ہیں۔ واللہ اعلم۔

حلق میں ڈور

محمد کاشف، عزیز آباد۔ خواب اور تعبیر کا کالم شوق سے پڑھتا ہوں۔ بعض خوابوں کی تعبیر اتنی حیرت انگیز ہوتی ہے کہ سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ واقعی آپ لوگوں کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے عجیب سا خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ دیکھا کہ میرے حلق میں ایک ڈور ہے جسے نکالنا شروع کرتا ہوں تو خون بھی نکلنے لگتا ہے۔

تعبیر: زیادہ گفتگو کرنے سے آدمی کی انرجی ضائع ہوتی ہے اور اس قسم کے خواب نظر آتے ہیں جو غیبت اور بدظنی کے پردہ میں چھپے ہوئے رہتے ہیں۔ کوشش کیجئے کہ زیادہ باتیں کرنے کے بجائے چلتے پھرتے وضو بے وضو یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم پڑھیں۔ گھر میں صفائی کرتے وقت کونوں میں اور دیواروں پر صفائی کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ خواب میں آپ کی اصلاح کی گئی ہے۔ جہاں غیبت ہو خاموشی سے اٹھ آئیں۔

آدھا ہلال

نام شائع نہ کریں، ناظم آباد۔ خواب دیکھا کہ رات کے وقت مغرب میں ہلالی چاند چمک رہا ہے۔ اس کے کچھ فاصلہ پر ایک اور ہلالی چاند ہے جو اوپر کی طرف سے پورا نہیں اور پہلے والے ہلال سے زیادہ روشن ہونے کے ساتھ ساتھ تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔ بڑی بہن سے کہتی ہوں کہ دیکھیں یہ کیا ہے مگر وہ کہتی ہیں کچھ نہیں جیسے انہیں وہ نظر نہیں آیا۔ میں بحث کئے بغیر خاموش ہو جاتی ہوں۔ کچھ دیر بعد آدھا ہلال حرکت کرتے ہوئے پہلے والے ہلال کے دوسری طرف پہنچ کر مکمل ہلال بن جاتا ہے۔ بہن کو دکھایا تو ان کو بھی نظر آ گیا۔

تعبیر: خواب اچھی امید سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، آمین۔

رقیہ بانو، کراچی۔ تعبیر: بڑوں سے مشورہ کرکے فیصلہ کریں۔

نورانی لہریں

محمد فہد اشرف، گلستان جوہر۔ کچھ لوگ خانہ کعبہ کا طواف کرنے میں مشغول ہیں جب کہ میں دور سے دیکھ رہا ہوں۔ اتنے میں ایک لمبا شخص جس کا قد بارہ فٹ کے قریب محسوس ہوا، آکر زور سے کچھ کہتا ہے جیسے اعلان کیا ہو۔ اس کی زبان میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اعلان کرتے ہی لوگ ایک طرف ہوجاتے ہیں اور خانہ کعبہ تک راستہ بن جاتا ہے جس پر چل کر خانہ کعبہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہاں میں نے ایک کھڑکی دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ خانہ کعبہ پر نورانی لہروں کا ہجوم ہے۔

تعبیر: الحمدللہ خواب نہایت مبارک ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سعید ہیں۔ درود شریف پڑھنے کا اہتمام جاری رکھیں۔ مجھ عاجز بندہ کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کام یاب اور کامران کرے، آمین۔ بزرگوں کو سلام۔

ماہنامہ قلندر شعور اکتوبر 2019ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:.................................... والدہ صاحبہ کا نام: ....

پورا پتہ:..

ازدواجی حیثیت:.......................... وزن (تقریباً): .... آنکھوں کا رنگ.............................

نیند کیسی آتی ہے:.................. بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):.................. تاریخ پیدائش:..........................

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.............................. فون نمبر..............................

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات : ....

....

فلم دیکھ لی

رحمت بی بی، مشرق وسطیٰ۔ اپنے تیس سال پرانے گھر میں موجود ہوں۔ گھر کے ساتھ ساحل ہے جہاں سے بے شمار مچھلیاں گھر کے صحن میں آرہی ہیں۔ کچھ مچھلیاں لے کر باقی سمندر میں ڈالتی ہوں کہ بڑی ہوجائیں گی۔ تھوڑی دیر بعد منظر بدلا اور گھر کے باہر زینہ غائب ہے جب کہ دیوار میں دو راستے نظر آئے۔ میرے ساتھ بہن ہے اور ہم دونوں کو اس راستہ سے گزرنا ہے جسے سوچ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ کہتی ہوں کہ اس راستہ سے بہتر ہے کہ رسی کی مدد سے عمارت کے نیچے اتر جاؤں۔ بہرحال پہلے بہن کو کوشش کر کے داخل ہوتی ہے پھر میں۔ اس راستہ سے باہر آتے ہی زینہ نظر آیا۔ ایک خاتون سے کہتی ہوں کہ میں تیس سال بعد یہاں آئی ہوں۔ وہ کہتی ہیں یہاں کے ایسے رہائشی جن کے پاس چابی ہو صرف انہیں یہ زینہ نظر آتا ہے۔ یہ سن کر میں مطمئن ہوگئی۔

تعبیر: خواب ماضی سے متعلق ادھر ادھر کے خیالات کی فلم ہے اور فلم آپ نے دیکھ لی۔

نوشین، کراچی۔ **تعبیر:** وقت پر نماز کی پابندی کے لئے ہدایت کی گئی ہے۔

خون میں خرابی

خون میں غیر صحت مند رطوبتیں شامل ہونے کی وجہ سے خون خراب ہوجاتا ہے اس سے طرح طرح کی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جن میں جلدی امراض بھی شامل ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۸ ۷۸۶	۱۱ ۷۸۶	۱۴ ۷۸۶	۱ ۷۸۶
۱۳ ۷۸۶	۲ ۷۸۶	۷ ۷۸۶	۱۲ ۷۸۶
۳ ۷۸۶	۱۶ ۷۸۶	۹ ۷۸۶	۶ ۷۸۶
۱۰ ۷۸۶	۵ ۷۸۶	۴ ۷۸۶	۱۵ ۷۸۶

یہ نقش چال کے مطابق زردے کے رنگ اور عرق گلاب سے لکھ کر صبح، شام اور رات ایک ایک پلیٹ پانی سے دھو کر کر نوّے دن تک پئیں۔

نوٹ: کونوں میں دیئے گئے ہندسے نقش کی چال کو ظاہر کرتے ہیں۔ نقش میں یہ ہندسے نہیں لکھے جائیں۔

tion, therefore whenever an idea comes to mind, it is from God.

Defining the law of the inventions, Azeemi sahib says, "Various scientific inventions such as airplane, computer, television, telephone etc. came into being when the knowledge of invention and innovation was inspired by God. Without knowledge, the existence of anything cannot be discussed. Man finds what he is seeking after. God does not consider whether someone has faith in Him or not."

In prevalent sciences, researchers benefit from past scientists, their books and documents. New theories, new angles of research are presented in journals. Before presenting their theses, writers and reviewers take care of the fact that the theory has been thoroughly considered in the light of previous observations and researches.

Azeemi sahib says, "The consciousness of human species is, in fact, collective consciousness".

This means that the level of awareness today was not produced in a day, or a month or a year or a century. Instead, it is a collective awareness acquired by the first man on earth and men and women after him, until now. In the background of the theories given in research papers, we cannot ignore revealed knowledge and beliefs. As contemporary sciences and theories are defined with the help of technologies, this knowledge and science is also defined with the help of formula and laws.

The interpreter of this knowledge Mr. Azeemi says, "In Quran and other scriptures God did not reveal the story of Prophet Solomon (PBUH) only to impress us. God does not need to impress us. God's knowledge is unlimited. God desires us to adopt a right path and that we move ahead after having seen people moving in right direction. These days, all the drivers of scientific technology indicate only one desire, that is, how to perform maximum activities in minimum time."

As mentioned earlier, the scientists are searching sources of information. The source which could provide maximum information in minimum time, help process it and channel it to new inventions. The examples given earlier indicate that human brain receives information from conscious awareness as well as sub conscious. Any inspiring thought is the beginning of this process. For instance:

One thinks about a friend — doorbell rings and the friend is at the door . One thinks of a pigeon in the sky— looks up and there is a pigeon. One thinks that balance will be lost— the next moment one falls. One desires ice cream— and someone brings ice cream. These all are pieces of information stored in subconsciousness and are received directly by our brain and recognized as sixth sense.

To be continued…

creates issues of understanding and ambiguities.

The origin of the Pyramids of Egypt, tall pillars of Persepolis in Iran, England's Stonehenge and the civilization being discovered under the melting snow of Antarctica is still a secret. Researchers and historians have not provided a common opinion about the origin of these wonders.

The spiritual scientists seek guidance from revealed knowledge that unifies varied theories. The revealed knowledge did not originate in human consciousness.

The evolutionary stages of scientific knowledge indicates that ideas of scientists like Galileo, Copernicus, Einstein and Stephen Hawking were exceptions among their contemporaries. As soon as their ideas were made known, many appreciated them and many went against them. But with time, comprehension of their ideas deepened and they became popular. A class of supportive scientists came into being which also experimented to prove new ideas and theories.

Qalandar Baba Auliya (RA) says that a writer or a thinker conceives an idea centuries before its actualisation. This idea comes to his or her mind spontaneously. When he presents this idea, he is laughed at and the idea is mostly rejected. And centuries later when a scientist practically realises this idea, the world is surprised. The world is not merely surprised but it starts eulogizing the actual thinker. Why is this that those who propose an idea cannot give it a material shape?

The idea is produced in one corner of the world centuries ago but implemented in another corner of the world centuries later. Time and space are not similar. Are distances between two timeframes and two spaces real? or just a figment of imagination?

In history, we find an angle as well as technologies that have only one origin. Well known British writer, a former Roman Catholic Nun Karen Armstrong while making a presentation in Ted Awards says, "In all the religions, knowledge originates from a similar source that tells us the best way to lead life. They all are connected with a common axial line".

This unique thought points to certain observations that have not changed through centuries. Centuries have passed but this knowledge as well as experiments on its basis continues to be unchanged. This is called Qalandar Consciousness.

Drawing attention to this dimension of information, Mr. Azeemi says, "God says that He bestowed on David and Soloman a knowledge which was inspired by Him."

Whether inspired by seeing or hearing, inspiration comes from God. Since knowledge is sent to God's Prophets through revela-

invented later).

In other words, earlier there was only one medium between observer and observation. Now in this observation microscope, telescope, thermometer were added and observation now becomes subordinated to secondary inventions.

Light plays an important role in shaping human observation. As Qalandar Baba Auliya (RA) said, "We see, read and hear light. When light changes, observation transforms too."

For instance, we see ourselves in a photo taken through a camera. This, in fact, is light which is reflecting from our face on the photographic plate. There are other ways also to create an image such as X-ray, ultraviolet rays, radio waves, Kirlian photography etc. Unlike visible lights, X-rays could penetrate bodies and see what is inside. Contrary to it, ultraviolet rays see heat centres in bodies. Images taken through this procedure show shades of various temperature levels emitting out of body.

Radio waves see objects as dielectric. For instance, water in our bodies is a good conductor of electricity whereas fat and tumour are semi-conductor or non-conductor. Radio waves recognize objects in various shades and capacities to conduct electricity.

Kirlian camera functions differently. In this camera an object is placed in the middle of a magnetic field. Electromagnetic rays emitting from the object collide with light rays of camera and produce an image which is recorded on photographic plate.

What is important is the fact that all these images which are taken using various procedures such as common camera, x-rays, ultraviolet rays etc., are of one object. These images show varied qualities of the same object. Through these procedures one can investigate various angles of an object hidden from ordinary camera. This shows difference in observations.

The change in observation could change theories about the object being observed. These differences in observation could emerge in the work of two contemporaries or between two individuals living several centuries apart.

The source of neutral thinking i.e. the Holy Quran and other scriptures inform that God's ways (God's Sunnah) do not change. This means that natural laws do not change.

We, therefore, conclude that since the inception of this world, natural occurrences such as light, water, clouds, evaporation, blowing of winds, animals, birds and plants are being produced as per a common law. Yet, human knowledge offers a discrepant account of evolution. Whenever we try to understand one era with the knowledge of another era, it

whether a man or an animal, eye is made of matter and matter can view within certain confines. Therefore, conscious observation remains limited or faulty.

Khwaja Shams al-Din Azeemi says that reality is one and there is no change in it. This means that the understanding of things after observation is only one. It may be kept in mind that observation is the name of the knowledge derived from all the senses. The five senses and their subsidiary senses are assisting in the acquisition of these observations. If there is a difference in the results acquired of this knowledge, it is because of deficiency in observation or lack of understanding.

These days, the scientists stress unification in their theories. The theory of spread of universe and its birth, quantum theory and string theory define universe differently. The most important element in this, are different ways of observation. The scientists are still grappling with the problem of unifying these three theories.

God says, there is no change in the ways (*Sunnah*) of God.

Natural laws, formulas of creation and coordination among them follow certain rules which are also seen in prevalent scientific inventions and innovations. Any insignificant change in their formulas could drastically change the face of these inventions. This change and their impact are studied under Nanoscience.

In Nanoscience, things are studied at the level of particles where distances are measured 1 billionth part of a meter. This distance is observed through special microscopes. Human brain views the viewing of the lens of eye and the lens of eye is viewing the viewing of lens of microscopes. This way, the use of material media increases manifold in the act of viewing. It is not difficult to understand that every layer has an angle. Every layer is matter. Matter is limited, therefore, observation is also limited. When limitation caused by a form of matter is augmented by limitation of another form – layer by layer – how erroneous would be the final observation.

In prevalent sciences, matter is observed through matter. A material thing is enhanced by using material means such as microscope or telescope. In order to determine temperature we use thermometer which is made of glass and mercury. The use of matter to observe matter creates a deception causing a gap in the understanding of scientific theories. The main reason for this is that the scientists while observing matter forget that they are observing matter through matter. When the means of observation change, observation changes too.

Khwaja Shams al-Din Azeemi says that the understanding which depended on eyes, nose, ears and tongue, now depends on subsidiary objects (created or

What Do We See?

In order to determine temperature we use thermometer which is made of glass and mercury. The use of matter to observe matter creates a deception causing a gap in the understanding of scientific theories.

It needs to be taken into consideration as to when the source of voice is emitting a particular wave, why is it being perceived variedly? A snake hears low sounds which cannot be sensed by human ears such as vibration before earthquake. Similarly, a bat could hear over 20,000 Hz and has the capacity to measure the distance through sound. But human ear cannot pay attention to these sounds.

Here, readers could think that humans or other living things understand sound as per the capacity of their hearing organs. We would here raise a question that what is the true nature of the sound being received and how could this nature be heard and understood?

The observational faults in hearing and vision may be understood as per another system of five senses.

Nose plays a fundamental role in smelling. The sense of smelling has various elements. Smell reaches human brain through a complex network of nerves where brain perceives smell consciously. Such as perfume of flowers, stench of blood or rotten fruits etc. The olfactory system in humans and other animals is different. Man considers the smell of blood as stench whereas Shark fish consider it the best of perfumes and could recognize it from great distances. Dog's smelling powers are stronger than other animals. It helps it recognize criminals or drugs being smuggled. However, man's smelling capacities are limited.

The reason for this is limited spread of nerves that conveys the sense of smell comprising 5,000,000 nerves. In a fox, the spread and sensitivity of these nerves are 150 times and in a dog 10000 times greater than man. This means that different species are observing the same thing in various ways.

As Bertrand Russell explained, various living things observe sunflower in various colours and contexts. The question is that: is there a way to observe a thing in its entirety?

The interpreter of the theory of *Rang-o-Noor* says, "Conscious mind views within the confines of materialism. Matter is limited and in the confines of matter, conscious mind can never understand the reality."

It transpires that God has created formulas of creation in layers. Therefore, irrespective of who possesses the observing eye,

down for us a table spread with food from heaven? He said: Observe your duty to God, if ye are true believers. They said: We wish to eat thereof, that we may satisfy our hearts and know that thou hast spoken truth to us, and that thereof we may be witnesses. Jesus, son of Mary, said: O God, Lord of us! Send down for us a table spread with food from heaven, that it may be a feast for Us, for the first of us and for the last of us, and a sign from Thee. Give us sustenance, for Thou art the Best of Sustainers. God said: Lo! I send it down for you. And who so disbelieveth of you afterward, him surely will I punish with a punishment wherewith I have not punished any of the creatures." (Quran, 5:112-115)

God granted the prayers of Prophet Jesus (PBUH). The people saw angels descending from heaven with a table. Prophet Jesus (PBUH) offered prayers in gratitude to God. Lids were removed from dishes and people saw fried fish, fresh fruits and bread. The aroma spread all over them and they were enticed.

Prophet Jesus (PBUH) invited them all to start eating. However, they requested that he start first. Prophet Jesus (PBUH) said "This is not for me, this has been descended on your demand." When the people heard this, they became worried over what the consequences for having the food were.

(Episode 3)

Why Did You Doubt?

Once, Prophet Jesus (PBUH) commanded his disciples to go to the other side of the sea of Galilee to Bethsaida. In this time, he went into the hills to pray. Night had fallen and the boat of the disciples was out at sea. A strong wind was blowing, and the strong waves wore them out.

Before dawn, Prophet Jesus (PBUH), knowing his disciples were suffering, came to them by walking on the sea. When they saw him walking on the water, they cried out in fear, thinking that they were seeing a ghost.

Prophet Jesus (PBUH) immediately said, "Take heart, it is me. Have no fear."

Hearing this, one of the disciples expressed his desire to join him on the water.

Prophet Jesus (PBUH) said, "Come." The disciple got off the boat and walked on the water towards Prophet Jesus (PBUH). At the halfway point between the boat and prophet, he saw the huge waves surrounding him, and was filled with fear. The fear and doubt shrouded his senses and his faith vanished. He began to sink, and cried out for help.

Prophet Jesus (PBUH) immediately reached out his hand and caught him, saying, "O man of little faith, why did you doubt?"

Insurgence

God blessed Mary (PBUH) with Prophet Jesus (PBUH) when insurgence and transgression was at its peak.

"And verily We gave unto Moses the Scripture and We caused a train of messengers to follow after him, and We gave unto Jesus, son of Mary, clear proofs, and We supported him with the holy Spirit is it ever so, that, when there cometh unto you a messenger with that which ye yourselves desire not, ye grow arrogant, and some ye disbelieve and some ye slay? And they say: Our hearts are hardened. Nay, but God hath cursed them for their unbelief. Little is that which they believe."

(Quran, 2:87-88)

"And (I come) confirming that which was before me of the Torah, and to make lawful some of that which was forbidden unto you. I come unto you with a sign from your Lord, so keep your duty to God and obey me. Lo! God is my Lord and your Lord, so worship Him. That is a straight path. But when Jesus became conscious of their disbelief, he cried: Who will be my helpers in the cause of God? The disciples said: We will be God's helpers. We believe in God, and bear thou witness that we have surrendered (unto Him)." (Quran, 3: 50-52)

Sincere and devoted disciples had faith and firm belief but they were simple and poor. With pure intention and pure heart, they requested, "God is Omnipotent and your birth is a sign of it. God has the power to send down to us a dining spread from heaven so that we become free from the worries of earning for a living, and can remain busy with preaching whole heartedly."

Prophet Jesus (PBUH) advised them, "Indeed, God is Omnipotent. However, it is not a good idea to test God for the sake of one's own ease. It is therefore better to eradicate such thoughts from your heart."

The disciples replied, "We do not wish to test God. We only wish to take it as a gift from God for our life. It would strengthen our belief in God and we would become witness of your message."

Seeing their persistent wish, Prophet Jesus (PBUH) made a prayer to God,

"O God, Lord of us! Send down for us a table spread with food from heaven, that it may be a feast for us, for the first of us and for the last of us, and a sign from Thee. Give us sustenance, for Thou art the Best of Sustainers."

The Table Spread of Blessings

God sent the revelation, "Your prayers are granted. I will certainly send it down unto you, but if any of you after that resisted faith, I will punish them with a penalty such as I have not inflicted upon any one among all the peoples."

The Holy Quran says: "When the disciples said: O Jesus, son of Mary! Is thy Lord able to send

springs." (Quran, 23:50)

A New Star

Many events occurred that gave glad tidings of the birth of Prophet Jesus (PBUH).

The king of Persia saw a new star in the sky when Prophet Jesus (PBUH) was born, so he asked his prophesier about it in court. They informed him, "The rise of this star gives news of the birth of a very great person born in Syria."

The king sent his delegation to Syria with precious gifts and fragrances to find details about the birth of the child.

The delegation reached Syria and began investigating. They asked the Jews to tell them about the birth of the child who would soon be the King of Spirituality. When the Jews heard this, they informed King Herod about it. King Herod called the delegation to his court and asked them about the purpose of their visit. When he heard their narrative, he became worried and allowed them to find out more details about the child.

The delegation from Persia reached Bethlehem and when they saw Prophet Jesus (PBUH), they bowed before him out of respect as per their tradition, and applied different fragrances on him. They stayed there for some days and during their stay, some of them saw in a dream that Herod would turn out to be the enemy of Prophet Jesus (PBUH), and were advised not to revisit the king, but to go to Persia straight from Bethlehem.

They came to honourable Mary (PBUH) and said, "It seems that the King of Judea, Herod, has evil intentions. He will become this holy child's enemy. It would be better if you moved away from his reach".

Mary (PBUH) took Jesus (PBUH) to Egypt to stay with her relatives, and from there went to Nazareth. She returned to Bethlehem along with Prophet Jesus (PBUH) when he turned 13.

Bukhari Shareef

There is a quote from Prophet Muhammad (PBUH) in *Bukhari Shareef* that mentions his meeting with Jesus (PBUH) during *Mairaj* (the Night of Ascension).

"I met Prophet Jesus (PBUH), and I found him of moderate height with a reddish complexion. His body looked so clean that it seemed as though he had just taken a bath."

Before the birth of Prophet Jesus (PBUH), the people had made traditions based on idolism a part of their religion. They considered unethical behaviour such as lying, deceiving and harbouring jealousy as good deeds. Instead of being sorry for their actions, they took pride in it. They even had no problem with killing their own guides and messengers. The Jew scholars amended the Torah and made legal things illegal and vice versa, in order to receive donations and gifts from people.

Prophet Jesus (PBUH)

The people saw angels descending from heaven with a table. Prophet Jesus (PBUH) offered prayers in gratitude to God. Lids were removed from dishes and people saw fried fish, fresh fruits and bread.

The Holy Quran has narrated details of the story as follows:

"And she who was pure, therefore We breathed into her of Our spirit and made her and her son a token for peoples."

(Quran, 21: 91)

"And Mary the daughter of 'Imran, who guarded her purity; and We breathed into her of Our spirit". (Quran, 66:12)

"And she, conceived him, and she withdrew with him to a place. And the pangs of childbirth drove her unto the trunk of the palm tree. She said: Oh, would that I had died ere this and had become a thing of naught, forgotten! Then (one) cried unto her from below, saying: Grieve not! Thy Lord hath placed a rivulet beneath thee, And shake the trunk of the palm tree toward thee, thou wilt cause ripe dates to fall upon thee. So eat and drink and be consoled. And if thou meetest any mortal, say: Lo! I have vowed a fast unto the Beneficent, and may not speak this day to any mortal. Then she brought him to her own folk, carrying him. They said: O Mary! Thou hast come with an amazing thing. Oh sister of Aaron! Thy father was not a wicked man nor was thy mother a harlot. Then she pointed to him. They said how can we talk to one who is in the cradle, a young boy? He spake: Lo! I am the slave of God. He hath given me the Scripture and hath appointed me a Prophet, and hath made me blessed wheresoever I may be, and hath enjoined upon me prayer and alms giving so long as I remain alive, and (hath made me) dutiful toward her who bore me, and hath not made me arrogant, unblest. Peace on me the day I was born, and the day I die, and the day I shall be raised alive!" (Quran, 19:22-33)

The children of Israel were surprised to hear such intellectual speech from the infant boy. They realised the innocence of Mary (PBUH) was indeed true, and that the birth of the child was a sure sign from God. The news of the miraculous birth of Prophet Jesus (PBUH) spread everywhere. The righteous took it as a blessing, whereas those with evil intent and mischief in their hearts took it as bad news, and they began to burn with jealousy from inside out.

God continued to educate the child under His supervision and protected him, so that through him the dead hearts of the children of Israel would come back to life, and prosperity would be brought to the spirituality within them.

"And We made the son of Mary and his mother a portent, and We gave them refuge on a height, a place of flocks and water

2. The other kind are those with a strong belief in God, who keenly observe circumstances and situations in their lives. For example, they would have been blind had they had no eyes, they would not have been able to eat or converse without a mouth, they would not have been able to survive without their limbs, and their very bodies would not exist had the Benevolent and Compassionate Creator not made their heart an instrument to pump blood through their body. To pay absolute gratitude to our God Almighty, every part of our body guarantees that He is the Owner of life and death. He is The Bestower of Sustenance. Along with providing sustenance, He also produces energy from it. He blesses us with a sweet and calming sleep to support a healthy mind and physical well-being as well as many other resources.

Countless boons and limitless sustenance from our God Almighty certify that He wants to see us live happily. God says in the Holy Quran,

"Lo! verily the friends of God are those on whom fear cometh not, nor do they grieve."

(Quran, 10:62)

If readers carefully asses and contemplate, they will realise that everything is emanating and travelling back into *ghaib* (the Unseen). This means that all creations of God are breathing within the dominion of God's attributes.

The essence of this article is that 'Gratitude' is an illumine star that carries nothing but happiness, peace and fulfilment.

The Creator of the universe, our Beloved God Almighty says in Quran,

"And when your Lord proclaimed: If ye give thanks, I will give you more" (Quran, 14:7)

Love is Mute

Love has no labels, no definitions. It is what it is, pure and simple. Love is the water of life. And a lover is a soul of fire! The universe turns differently when fire loves water.

The universe is a complete unique entity. Everything and everyone is bound together with some invisible strings. Do not break anyone's heart; do not look down on weaker than you. One's sorrow at the other side of the world can make the entire world suffer; one's happiness can make the entire world smile. Most of the conflicts and tensions are due to language. Don't pay so much attention to the words. In love's country, language does not have its place. Love is mute." — Hazrat Shams Tabrezi (RA)

V

S#	Abilities	Health	Resources	Friends and Relatives	Opportunities
1.					
2.					
3.					
Note: Self-Analysis sheet can be prepared, using this table as a guide					

How abundantly we are blessed by God! It is easy to count them if we make a self–analysis sheet and divide the list into different segments, such as our physical and mental abilities, economical resources, opportunities available at work or business, hopes in times of despair, sense of security developed in the presence of friends, relatives, and family members, etc.

The sheet for self-analysis given in this article is just an example. Readers should make their own sheet by listing resources and facilities available to them in their lives such as, free oxygen, water, air, and other essentials to sustain life. The statistics of this will reveal the plentiful things to thank God for.

One of the obstacles in learning and practicing the art of gratitude is the resistance of the consciousness. This is because we are constantly in the habit of taking the permanently available godsends to us for granted. We tend to feel and see the absence of things quicker than what we have.

How could someone who is not grateful to people, be thankful to God Almighty?

One must remember the good that people have done for them in order to be thankful to them.

When the mistakes of others, faults and shortcomings are visible to us more often and on a recurring basis, then one must look inward and assess their own deficiencies, failings and defects.

Keeping an eye on our own shortcomings and not exposing the faults of others helps in significantly reducing arguments and complaints from others.

It is easily observed that there are two kinds of people in the world with different mind sets.

1. Those who make a dull and miserable face, day and night and lament about their complaints, grievances, thanklessness, and unwarranted desires. They blame and curse themselves and others, instead of taking remedial steps to come out of their despondency and anguish.

ed for you night and day that therein ye may rest, and that ye may seek His bounty, and that haply ye may be thankful."

(Quran, 28:73)

"And when your Lord proclaimed: If ye give thanks, I will give you more." (Quran, 14:7)

"And of His signs is this: He sendeth herald winds to make you taste His mercy, and that the ships may sail at His command, and that ye may seek His favour, and that haply ye may be thankful." (Quran, 30:46)

Before discussing the benefits of thankfulness, let us first think about the things we should be thankful for. What are those plentiful and countless godsends that have been available to mankind from the first day of their arrival in this world?

The Holy Quran draws our attention to this with the following:

"And We have enjoined upon man concerning his parents. His mother beareth him in weakness upon weakness, and his weaning is in two years. Give thanks unto Me and unto thy parents. Unto Me is the journeying." (Quran, 31:14)

"And verily We gave Luqman wisdom, saying: Give thanks unto God; and whosoever giveth thanks, he giveth thanks for (the good of) his soul. And whosoever refuseth Lo! God is Absolute, Owner of Praise." (Quran, 31:12)

"That they may eat of the fruit thereof, and their hand made it not. Will they not, then, give thanks?" (Quran, 36:35)

"One with whom was knowledge of the Scripture said: I will bring it thee before thy gaze returneth unto thee. And when he saw it set in his presence, (Solomon) said: This is of the bounty of my Lord, that He may try me whether I give thanks or am ungrateful. Whosoever giveth thanks he only giveth thanks for (the good of) his own soul: and whosoever is ungrateful (is ungrateful only to his own soul's hurt). For lo! my Lord is Absolute in independence, Bountiful."

(Quran, 27:40)

The Great Sufi Master, Qalandar Baba Auliya (RA) once asked his student, "How many eyes do you have?"

The student answered, "Two". Qalandar Baba Auliya (RA) followed, "Where are they located? At the front or the back?"

The student said, "In front, under the forehead".

The master replied, "God wants you to look forward. If looking back was significant, God the Mighty would have placed one eye at the back of the neck as well".

In order to be grateful, we must first enumerate what we are blessed with. God has blessed us with eyes, ears, a nose and heart etc. that we should be grateful for.

cherish and enjoy our blessings, which leads to hopelessness.

If one looks around and observes the usual behaviour of society, one can safely say that no matter from which segment of society people belong, it is observed that the majority of people are ungrateful. They view things from the lens of 'have nots' with a 'half empty' kind of attitude. They are not in the habit of paying gratitude to the boons bestowed upon them directly by God Almighty, or for the things they have received through a medium.

God Almighty says:

"And We have given you power in the earth, and appointed for you therein a livelihood. Little give ye thanks!" (Quran, 7:10)

Once, Sheikh Saadi was sad as he did not have any shoes. He then saw someone walking with the support of crutches. As he saw it, he was deeply moved and immediately offered gratitude to God Almighty that he was given healthy legs to walk with.

The best way to learn the art of thankfulness is to look at those less privileged whether that be economically, socially or in terms of intellect, instead of looking up all the time. This enables one to find those who are happy and content without the amenities that they possess.

The Great Sufi Master, Qalandar Baba Auliya (RA) once asked his student, "How many eyes do you have?"

The student answered, "Two". Qalandar Baba Auliya (RA) followed, "Where are they located? At the front or the back?"

The student said, "In front, under the forehead".

The master replied, "God wants you to look forward. If looking back was significant, God the Mighty would have placed one eye at the back of the neck as well".

The gist of this conversation is that we should not be wistful about the time passed, but should move on.

The third step is to understand 'effort and outcomes'.

It is easy to find what we do not have, because everything around us make us realise the facilities and amenities we lack. But the outcome of this 'easy act' is misery. This attitude not only inflicts misery, but weakens the body too. And it does not end here, the impact of our attitude is directly felt by the people around us and it affects all of our relationships, triggering a never-ending 'chain of imbalance' in our life.

When stuck in this 'chain', our gaze never settles upon things, people, and matters granted to us from God, in the shape of family, friends, relatives, work and businesses.

"Of His mercy hath He appoint-

tion to many complex problems and is an important landmark in a complacent life of contentment.

The Holy Quran says:

"And God brought you forth from the wombs of your mothers knowing nothing, and gave you hearing and sight and hearts that haply ye might give thanks."

(Quran, 16:78)

It is a common approach to only mention those things that we either do not have, or deem necessary in our lives. But whilst doing so, we do not pay attention to the vital things that are already available to us to sustain our lives. This act makes us miserable.

Using the abilities and resources available to us is called 'gratitude'.

The secret to a successful and peaceful life lies in the act of gratefulness. One's wish to become successful paves way for the betterment of other people as well, because their growth affects people around them too. Thus, to wish for progress and struggling to attain one's goal, propels development in the world.

However, there is a difference between putting in effort to improve what we already have, and the desire to hoard wealth. The majority of the people, in their continued hunt to get whatever they can, are never gratified nor happy for the resources available in their lives.

There is no limit to how much they want. There would never be a point in time where they would accept things as 100% perfect and put an end to their desires.

It is a common trend to feel sad about the things we had owned in the past, or worry for the things we anticipate in the future. In doing this, people neglect the resources present at their disposal.

The first step to become grateful is to live and be content with one's present.

Many people have heard about Helen Keller. Undeterred by deafness and blindness, she communicated with her sense of touch. Her passion and enthusiasm to do remarkable things in her life facilitated and encouraged her to the point that she rose up to become a majorly celebrated character of the 20th century.

Helen Keller wrote, "I am glad for the benevolence of my God over me. If I were given all the advantages such as; eyesight, speech, and hearing, I might not have been a well-celebrated lady, rather, I'd be an ordinary person."

For us to have a successful life in harmony and peace, it is important to focus upon what we have, instead of worrying about what we do not. The two most important things in our lives is to firstly, get what we wish for, and secondly, enjoy whatever we receive. Normally, we forget how to

The Art of Gratefulness

When the mistakes of others, faults and shortcomings are visible to us more often and on a recurring basis, then one must look inward and assess their own deficiencies, failings and defects.

Human search and pursuit is constantly expanding the span of knowledge. New discoveries are made in various faculties of knowledge that discuss human behaviour, their habits and mannerisms, personal relations, and peace of mind.

Training programs regarding the law of attraction, law of abundance, psychology of achievement, habits of the successful, and behaviours of peaceful families are helping people to think positively, be optimistic as opposed to despondent, focus on the bright side of affairs, find paths to peace and happiness, and improve relationships at home and at work.

One of the most important secrets behind successful, positive and happy people is that they are 'grateful'.

All divine books, including the last book – the Holy Quran – describe how 'thankfulness' is a necessity, and how it is a habit and action that is most favoured by God Almighty.

"Give thanks, O House of David! Few of My bondmen are thankful." (Quran, 34:13)

Gratefulness is an art that not only can be learned, but with practice, if it becomes a part and parcel of life, can take us to the path that leads to a peaceful and successful life.

Before we shed light on the subject of gratefulness, there are some questions to refer to from two different perspectives:

- What do I lack in my life?
- Why are my children less competent than others?
- How much are my friends ahead of me in life?
- How rich am I?
- How smart and intelligent am I in comparison to my friends?
- How much does my boss understand me?

Now let's view these questions from a different angle.

- What do I have in my life?
- How innocent and great are my children?
- How blessed am I?
- How much does my family love me?
- What great qualities do my friends possess?
- What opportunities do I have for promotion in my professional life?

A realisation and appreciation of blessings in one's life is the first step towards a happy life. This thinking pattern is the solu-

But what use would that be when it was knowledge we had not experienced ourselves? So, we all remained silent.

The conversations continued after with many other questions and he patiently answered each of them. As we returned, we had no intention of straying from his teachings. Our minds were gripped in the memories of our time with him. Why was this so? This question resided in each of our hearts.

One amongst us began to reminisce on his time with Mr. Azeemi and began to share his experience about a time when Mr. Azeemi had asked a crowd, "Why do you not remember the teachers who taught you in school, but remember your spiritual master at all times and in all experiences of your life?

It is because the teacher at school teaches you knowledge of the material world, which is nothing but fiction. But your spiritual master teaches you about Reality. And this is something you never forget, hence you never forget the one who delivered the Ultimate Truth to you."

What a Faqir can offer your soul through nothingness,

Surpasses an entire universe placed at your feet.

Intention + Command = Creation

Maulana Muhammad Idris Al-Ansari (RA) from Sadiq Abad is Mr. Azeemi's older brother. He said, "Unless it is God's Will, nothing happens, and nothing gets done. Neither a leaf moves nor a particle. But! His Will is displayed by going through the veils of desires, provisions and creations.

Translation of poetry: 'It is the job of Your hair to spread musk. However, to protect the secret, lovers say that musk is extracted from the belly of a Chinese deer.'

God selects someone from His creations when He wishes to do anything in this world. He inspires commitment in one's heart. Later, He creates provisions for the completion of that task and blesses the appointed one. If it requires hard work, He selects a hard worker. If the work requires wealth and status, He inspires willingness and love for the work in the heart of one who is well off and has a high status. Finally, by the blessing of God, the task is fulfilled, and this is how the Will of God is displayed.

Whatever and whichever creations you see in this world, believe that God intended to make them and it became."

— Book: *Halat-o-Maqalaat-e-Sufia*

the results and consequences to God.

"It is said that a woman was responsible for man being thrown out of paradise and hence was the cause of all trouble," The master said, as he looked straight into my eyes.

My love-struck eyes opened wide and almost had a tinge of sadness in them as he immediately laughed and said, "Women are like the Earth. Just as the Earth births everything out of it, a woman births the entirety of mankind out of them. Without women, mankind cannot exist. And my question is, if it is true that women can get a man thrown out of paradise, why then can she not get a man back into paradise?"

The respect that the spiritual master had for women was very evident in his words and tone. I must say, I witnessed many women in that room smile contently. But this happiness was only transitory. Like every sentence of his that has a million layers of meanings attached to it, how could this idea be far from it?

"Curd has bacteria that is visible only under a microscope. The more the bacteria grow and multiply exponentially, the better the quality of the curd. The weaker the bacteria, the more the quality of the curd will suffer. So what are you eating? Bacteria! If you could see them with your naked eyes, would you be able to eat it? The Angels are made of light and Jinn are made of the fire element.

He had suggested that we divide the 24 hours in a day into four equal parts of six hours each. The first six hours were dedicated to sleep. The second set of six hours to our vocation or career. The third set of six hours for our personal life, family and friends; and the fourth set, for spiritual development.

But Man is made of clay, which we could compare to yeast. Our bodies rot! If you could notice the yeast that is kept aside, you would experience a stench after some time. What consequence is this body, be it man or woman? When a child is born, you wrap it in a cloth and when it is time to die, once again the body is wrapped in a *kafan* cloth. What is the difference?"

The master continued, "Regarding the inconsequential status of the body, there is a story on Sheikh Abdul Qadir Jilani (RA). A woman requested his blessings that she be blessed with the birth of a child, and he did bless her, saying that she would birth a baby boy. The woman delivered a baby girl and came to inform him about it. He asked her to go home and check again. When she did so, she saw that it was a baby boy. So, what in this case, is the status of a human body?"

The question posed by the master echoed in all our hearts. We had no answers. At the most, we could reproduce what we had heard from His own teachings.

echoed in the silence that loomed after they had left home in pursuit of their dreams.

The spiritual master smiled and continued, “On the matter of husbands and wives, in the Holy Quran, God says,

‘They are clothing for you and you are clothing for them.’ (Quran, 2:187)

This means that they are incomplete without each other. A man and a woman complete and care for each other.

‘And all things We have created by pairs, that haply you may reflect.’ (Quran, 51:49)

In this verse, God has confirmed that everything in this universe is created in pairs. A man in his manifested form has a hidden woman inside him and vice versa. It is the hidden woman and the hidden man who yearn for completion and look out for each other through their manifested forms. And when they finally meet, they marry and form a sacred union.”

We all listened to him with great eagerness, and as we did, a thought crossed my mind. “Perhaps as a woman, I should just be a caretaker for my husband and children and give up my work profile?”

As if my thoughts had just been read, the master said, “Once you give birth to children, your duty is towards rearing them and ensuring that you serve them as per the responsibilities handed to you by God. You should provide them with education and comfort. If you cannot serve your children, how will you ever be fit to serve mankind? It is true that the resources for all creatures are provided by God, but we do not stop doing our duty and being in service. God needs nothing from us. He does not sleep, eat or drink, and yet He serves all His creatures without break. How can we then take breaks?”

We all hung our heads in embarrassment. Indeed, God has been serving us from the time of our inception till the present date, while humanity constantly tries to wriggle out of their responsibilities and shrink into their comfort zones. We were all reminded of the rules that had been passed down by the founder of Silsila Azeemia, Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA), to Mr. Azeemi.

He had suggested that we divide the 24 hours in a day into four equal parts of six hours each. The first six hours were dedicated to sleep. The second set of six hours to our vocation or career. The third set of six hours for our personal life, family and friends; and the fourth set, for spiritual development. This rule holds good for all humanity without differentiation.

The master was a living example to all of us on how to live a balanced life. Seeking happiness we realised is not through escaping our duties and responsibilities, but through balancing all spheres of our lives whilst surrendering

Life Lessons from a Faqir

"Curd has bacteria that is visible only under a microscope. The more the bacteria grow and multiply exponentially, the better the quality of the curd. The weaker the bacteria, the more the quality of the curd will suffer. So what are you eating?..."

When one meets a *Faqir*, the old mindset wants to assume that they will advocate renunciation from the material and advise immersing one's self in the thoughts of God alone. I also thought that the *Faqir* I was about to meet may advise me as a woman to settle comfortably as a nurturer and homemaker, rather than struggle to be an entrepreneur in this competitive world.

But when I, as part of a group of spiritual enthusiasts walked into the august presence of the Spiritual Scholar, Khwaja Shams al-Din Azeemi – the patriarch of the Spiritual School Silsila Azeemia – I soon realised how mistaken I was.

The fire in his eyes was far brighter than a blazing sun. I felt a shiver run through my spine as we all sat before him. It was not fear, but a certain feeling of, overwhelm and respect. He is a son, husband, father, grandfather, spiritual mentor for millions, author, philanthropist, educator, and more. How had I forgotten that he was an example of perfect balance in all spheres of life. He had only taken on more responsibilities for the sake of God, while the most of us think that the path to spiritual progression is all about giving up on things and people.

We readily accepted the cups of tea he offered us, not knowing that they were not merely cups of tea, but life lessons being served to us. Just as we were lost in the aroma of the home brewed *chai*, Mr. Azeemi spoke, "The tea is a perfect mixture of water and milk, is it not?"

We looked up from our cups and answered, "Yes".

He continued, "Can you now separate the two?"

"No," we replied.

"That is marriage," he said. "And now taste the tea, is it sweet?"

"Yes, it is," we said, nodding as we sipped the delicious brew.

"The sugar represents children in one's married life. They make life sweet. Have you noticed how gloomy the homes are of those who yearn for children? Children are the flowers in the garden of God. They have been given to us as blessings so that we remain happy."

I felt nostalgic as I remembered my own children who were all grown up and studying in far off universities. Indeed, my whole house was laden with their memories. Their laughter as tots and their noisy childhood riots still

visit their mentor in person, or communicate via letters. A disciple goes through many tests and exams, and they are corrected and given the right guidance in time if they remain in touch."

A poor person once came to know the secrets of spiritualism. He said, "I have gone through severe troubles to get here, and I will not return empty handed." He said that he was from Herat, Afghanistan, and had been to Khurasan, North Hind, Kashmir and Ladakh and had eventually reached Peer Baba (RA), waiting to be blessed. Peer Baba (RA) allowed him to stay with him. He responded to the sincerity with which Peer Baba (RA) taught him by following every teaching. He was blessed with concealed knowledge and was asked by Peer Baba (RA) to go back to his native home to serve the people.

❁ ❁ ❁

Since the beginning, Peer Baba (RA) used to avoid the company of kings, the life in a royal court, and worldly matters. His father had an important designation in the royal court, but despite that he avoided seeing kings, and always adopted the life of a *dervish*. Whether there was a difference of opinion or in matters related to friendship, all he did was for the sake of God, as he would view things only from God's perspective.

Regarding King Akbar's so called *Din-e-Akbar* (Religion of Akbar) and his attack on Swat and Buner, Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) has said, "People are trapped in the wrath of King Akbar because of what Prophet Muhammad (PBUH) had said, 'God punishes the people of a country with a cruel king when deviation from the right path becomes commonplace.'"

❁ ❁ ❁

Hazrat Ghawas Tirmidi's (RA) close disciple, Akhwand Darvisa says, "This is how I used to learn from Peer Baba (RA). I stayed in seclusion for a week to contemplate and do my spiritual exercises, and after that, I would share my feelings with *sheikh*. *Sheikh* liked my contemplation, appreciated me and my efforts, and would give me the next lesson."

It is a custom to not visit anyone empty handed. One may take anything as a gift as per their capacity.

Once Akhwand Darvisa visited Hazrat Ghawas Tirmidi (RA) after a long time. His master said, "Where have you been?" He replied, "I was short of resources, and I felt bad coming before you empty handed." Hazrat Ghawas Tirmidi (RA) replied, "Such a strange person you are! Do you not know that God sees the intentions and not the gifts themselves? The only ones I consider true disciples are those who come to me to seek spiritual blessings. People turn up with a cow, bull, camel or horse; I consider them gifts from God and distribute them among His creations. Those people are not my special friends or disciples, instead they are appointed by God to deliver me things."

❁ ❁ ❁

Even though there is a strong need to find a spiritual mentor, finding one is very difficult. However, once one arrives at their masters' doorstep, they must never leave from there, irrespective of what happens. Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) said, "It is mandatory for a student of Sufism to spend a good amount of time with their spiritual mentor. Also, the spiritual mentor must have the qualities that are mentioned in books of Sufism. A spiritual mentor must have been trained and blessed by a wise spiritual mentor themselves. If this did not happen, then how can they guide others?

A wise spiritual mentor attempts to impact the inner self of a student so that they remain busy with prayers after they become aware of the importance of piety and sincerity. For a Sufi, the heart is God's home. One's thinking pattern changes when their heart becomes enlightened, and one's actions change once their thoughts change."

❁ ❁ ❁

In the book '*Nazarya Rang o Noor*', the method to identify a spiritual mentor is stated as follows: "We need a teacher who guides us at every step and teaches us the desired skill. Unless an artist guides the students, they cannot attain expertise in drawing. Without guidance, the student cannot attain the zenith in art. Under the guidance of a teacher, a student awakens the hidden skill of art and drawing within themselves. A spiritual master first develops the spiritual skills in a student and later teaches them about it. In order to search for a spiritual teacher, it is mandatory for a spiritual student to spend time with a spiritual person, observe their days and nights, and assess how close they are to their soul. They should check to see whether they are influenced by the world or if they trust in God. A spiritual master is the one, in whose holy presence, the mind of a person turns attentive towards the unseen world, and no trace of sadness, fear, worries and tensions disturbs them. The diminishing lights of hope reignite. Another quality of a spiritual person is that they neither expect nor have greed or jealousy. One who attends their gathering feels as though their mind has become vast and capacious. Their minds become absorbed in the universal system in a way that a pattern of contemplation is activated, and knowledge of the unseen world starts descending upon them."

❁ ❁ ❁

Peer Baba (RA) was careful when accepting those who spiritually pledged themselves to him, as he believed that spiritual knowledge is something to be entrusted to others, and should only be transferred to those who are capable of it. He said, "To attain knowledge, it is mandatory to have a link with your *sheikh*. Going to the gatherings of God's friends is beneficial as their light enlightens hearts. In spirituality, it is mandatory to keep in touch with the *sheikh*. One should either

after being deemed a mad man. The humiliation and disappointment he will face will help him realise the truth.'"

❁ ❁ ❁

Thinking on this story shows us that to educate others, sometimes it is necessary to let them do what they want to do. Some things are so deeply engraved in a person's mind that they will never understand through words unless they experience it themselves. When one faces the consequences of their actions, they become cautious in the future and reform their thinking pattern.

This story is of a person who had a staunch belief. Contemplating on the words of Peer Baba (RA) shows us that to break the shell of his hardcore beliefs, incidents harsher than his shell would have to occur; for example, unease felt during travel, the traversing of turbulent paths, people's behaviour towards him, humiliation from the king, and being under open mockery as the target of ridicule. An individual does not differentiate between reality and fiction unless there is a strong blow sufficient to break the strength of their beliefs.

❁ ❁ ❁

Hazrat Peer Baba (RA) advised his disciples, "You must work very hard until you cognise the attributes of God and God Himself. Ensure that when you depart from this world, you have a firm belief in God, and make sure to help the creations of God from destruction and humiliation."

Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) warned people about fake spiritual masters. He said, "Some people use Sufism as a profession after learning some spiritual terminologies. One must be cautious of them, as how is it possible for them to guide you?"

In those times, there were those who deceived others by pretending to be great Sufi masters. The common folk would believe in them as they were not aware of what was right. Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) concluded that all trouble in the area was caused by these so called spiritual mentors and religious scholars.

Two brothers once came to where Peer Baba (RA) was staying and pretended to be spiritual masters. They were brought to Peer Baba (RA) who would generally stay clear of these matters, however, on that day, he had a different plan. One of the brothers said, "All seven heavens are under my control." The other said, "I have just received an inspiration that a great evil will descend here and strike from the seventh heaven."

Peer Baba (RA) ignored their claims, pointed to his disciple's turban, and said, "Forget about the heavens. Tell me, what is inside his turban?" The brothers avoided answering but could not escape the situation, so to avoid humiliation, they said, "There is some food inside his turban." The turban was unfolded and there was a blank piece of paper inside. The brothers immediately fled the scene.

❁ ❁ ❁

ciety cannot be brought to order.

Friends of God first purify the hearts of their students. Once their hearts become aware of sincerity, they become thoughtful and careful about their actions. A human cannot act against the Will of God when their heart is filled with the remembrance of God.

God has blessed pious people with the knowledge of the unseen. Therefore, they have the knowledge of truth and psychology. They kindly and expertly teach students as per their nature and capacity. The thinking pattern of God's friends spans the universe. They stay clear of contradictory matters, and those who come to them have their queries answered at a level that matches their mental capacity. Their way is the way of love. Aside from people's personal problems, they also happily answer questions related to spirituality in great detail if asked.

❁ ❁ ❁

Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) used to be very kind to everyone. He did not use a firm voice when correcting others. Instead, he would make them understand his point in a way that they would give up on their wrong beliefs and habits.

The following is an interesting story in this respect.

A close disciple of Peer Baba (RA), called Akhwand Darvisa, narrates, "*Sheikh* (spiritual master) and I were invited as guests to the house of a person who had mistaken beliefs that he had adopted from his father. On his father's deathbed, he had said to him, 'After 10 to 12 years of my passing, go to the court of the king of Delhi. I will be born as a prince there, and will be roughly ten or twelve years of age. I will recognise you once you come to me and reward you with bounties.'

He had such faith in his father's passing words that he bought two of the finest horses to present to the king and was all set to travel to Delhi. After hearing this story patiently and allowing him to finish, Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) said, 'You must follow your father's advice and go to Delhi to see the king.'

When we departed from there, I asked my master, 'Instead of stopping him, whose beliefs are weak, you have asked him to go to Delhi as per his father's advice and see the king. Is this not strange?'

My master smiled and said, 'This man has stuck by his fathers' false beliefs for years, and they are deeply rooted in him. We would not have succeeded in bringing him on to the right course by merely advising him. After undergoing troubles on his way to Delhi with his horses and other gifts, he will find no son of the king at 10 to 12 years of age. Even if the king did have one, the child would not recognise him. Also, why would he entertain him? He would not welcome him. Instead, he will be thrown out

Values of a Saint

"Such a strange person you are! Do you not know that God sees the intentions and not the gifts themselves? The only ones I consider true disciples are those who come to me to seek spiritual blessings…"

Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA), known as Peer Baba (RA) says, "The things that ordinary people cannot see, but become visible to the friends of God as their inner selves are clean and pure, is called *kashf*. Some friends of God do showcase *kashf* and perform wonderworking but some do not. Therefore, these abilities should not be considered as a measure of one's spiritual status."

Musing on the above shows us that desiring *kashf* and wonder working is a hindrance in the path of attaining spiritual knowledge. For the true student of spirituality, these abilities are nothing but scenery on the path to God. If one diverts their attention from their goal, it is adulteration in their desire and corrupts their aim and path.

In this respect, Peer Baba (RA) has said, "A disciple must pay attention to nothing but the remembrance of God, and should not worry over what other people talk about. Hazrat Khwaja Qutb al -Din Bakhtiyar Kaki (RA) said, ' There were and there are many beloved friends of God among the followers of Prophet Muhammad (PBUH) who have achieved quite a high status, but never publicised their *kashf* and wonderworking. The purpose should be to have faith and to consider prayer, spiritual exercises, piety and the best of ethics as fuel for one's life.'"

In the book '*Awariful Maarif*', it is stated, "Satan can turn a student of spirituality astray from the straight path if, from the beginning of their journey, they desire to achieve k*ashf* and wonderworking, and are not sincere in attaining the blessings and consent of God."

بکن بیرون زدل ہر ماسوارا

بیابی آں زماں سرّ خدارا

Translation: "You will know the knowledge of God once you remove everything from your heart but God."

❁ ❁ ❁

God's friends steer people's thoughts towards performing positive actions, as it is through one's action that their lives can become heaven or hell. One's actions reflects their thinking patterns. Hazrat Syed Ali Ghawas Tirmidi (RA) always advised people to lead a life emanating good actions.

Hence, a person must act first before advising others. If they find any action taken by others unpleasant, they should reflect on their own life and see how and where they commit the same actions. If they find the same flaw in their own lives, they should correct themselves. Without this, so-

V

is how 50 years of a man alternates between the process of *ghaib* (disappearance) and *zahir* (appearance).

> "Lo! we are God's and Lo! unto Him we are returning." (Quran, 2:156)

If transition between two moments does not take place after birth, it would not be possible to determine one's age. Therefore, to answer what life is, people of wisdom give us insight into the mechanism of birth, how it is simply a manifestation of *ghaib* and *zahir,* and how God has blessed *Insan* (humans) with the knowledge of it.

Dear readers, please muse over the formulae of birth.

Where were individual prior to their birth? We call that place *ghaib*. All creatures were in the realm of *ghaib* before coming into this realm, i.e. they appeared from *ghaib,* and will eventually disappear into it.

God, the most Beneficent and Merciful says,

> "Thereof We created you, and thereunto we return you and thence We bring you forth a second time."
>
> (Quran, 20:55)

May God protect you,

Every one drinks water on a daily basis, but does not contemplate what water is; what is in it that quenches thirst? How is water obtained? Is it from a well, stream or a river?

A common person does not think about such things. They simply drink water when they are thirsty. But the one who is blessed with *Nisbat-e-Ishq* (association with love) looks for signs of God within water and ponders over the fact that water is created by God. As they delve deeper into contemplating water, all the resources involved in it, such as the sea, clouds, and snow melting from the mountains appear before their eyes.

— Book: Sharah Loh-o-Qalam

but do not pay attention to the fact that every day after the sunset becomes the past.

Life is based on movement that has been taking place since time immemorial. The system of the universe would come to a halt if movement ceased to exist. Those who are aware of the knowledge of *movement* know that what is deemed as present and future, are the impressions of the past. One with this knowledge is appointed vicegerent, and as a result, everything in the universe submits to them through the Will of God. Since vicegerents are aware of their role in the universe, fear and grief disappear from their lives.

Example: We formulate a plan for 30 years. To materialise this plan, the span of 30 years is divided into six stages. In other words, the plan which was devised 30 years ago, is finally implemented in six steps. So, the efforts aimed at materialising the plan are in fact the act of rejuvenating or breathing life into the images of the past.

When nations sever ties with their past, and do not attempt to fix themselves by following in the footsteps of their ancestors, they are erased from the surface of the earth. On the other hand, the nations who remain in touch with their past, and adapt to the great acts of their forefathers, attain zenith. Therefore, a person who wants to be happy, should revert to their past on a daily basis and count the blessings of God in their lives. If they let go of expectations from people and make efforts by reposing trust in God, they will manage to break free from the grip of limitations. Such people are sheltered into a limitless expanse of life where there is neither fear nor grief.

Happiness is a natural phenomenon whereas unhappiness is contrary to it. An unhappy man moves away from their intrinsic nature, while a happy person is a world within themselves. This is why people are fond of them.

• • ——————————— • •

Dear readers, profound thinking over the course of life makes it evident that life traverses on the belt of *ghaib* and *zahir* (disappearance and appearance). When an individual appears in this realm, they disappear from the realm they have come from i.e. their birth in one realm is their death in the previous one. Every manifestation goes through the same Divine law.

When the sun sets, every new day (though it is not new) goes back into the *ghaib* and with the rising of sun, another day dawns. In short, the course of life and death indicates that the person appears once, and disappears twice to manifest from one moment or place to another. This

"Your ship reached its destination, and has earned a huge profit," the secretary informed happily.

Imam Sahib (RA) replied, "O' God! Thank you!"

The secretary asked curiously, "Sir, may I know why it is you thanked God when you were informed that your ship had sunk?"

Imam Abu Hanifa (RA) replied, "When you brought me news of the sunken ship, I looked into my heart and found not a trace of happiness or sadness. Rather it said, 'It all belonged to God.' Later, when you informed me that the ship had not sunk, my heart reaffirmed the same. The profit I have received is by the Will of God. I thanked God because He is the One who gives, and He is the One who takes back. When I found myself in harmony with the will of God, I thanked Him."

• • ——————————— • •

It is unwise for a man of 50 years to be upset over turning 51, as he does not contemplate his past, how he was born and nourished, and how God took care of all his needs from his birth till then. He had never been left hungry or deprived of clothing, he got married, had kids and then grandkids, and reached 50. He has a livelihood and his kids enjoy all the resources to have a good life. Why do such thoughts not occur to him? It is because *aadmi* is entrapped in the shell of their ego. They think about future, but never ponder upon the days gone by.

From a spiritual perspective, life – whether it is of human beings, planets, the Sun, Moon, trees, or of anything else, is nothing but a record of the Past. As Prophet Muhammad (PBUH) says,

"Do not inveigh against time, for Time is God."

The above saying of Prophet Muhammad (PBUH) gives us insight into the fact that the whole universe is in relation with God. For God is the Creator, the Owner, and the Provider who has made it mandatory upon Himself to grant provisions to all beings.

• • ——————————— • •

What is life? Is it present, past, or future?

While contemplating this question, one does not find the existence of the present or future time, because every moment is being recorded, and scenes that are recorded are called the past. Then what is the present and future? It is the division of the recorded time which we refer to as the past.

One is apprehensive about how tomorrow will unfold. But the truth is, tomorrow does not exist. We attribute to the coming day as tomorrow,

for the acquisition of resources, which leads to unhappiness. Unhappiness is equivalent to an injustice that we inflict upon ourselves, as the necessities to sustain life are provided by God to every individual, no matter whether they wish for it or not.

My friends, it is worth musing that the crop of wheat would not grow, and a grain of rice would not turn into a seed if God had not spread out the earth. Would it be possible to meet food requirements without sunlight? Had there not been birds and animals, we would have no meat and milk.

An *aadmi* (man) should also reflect upon the machinery within them. Do they play any part in keeping it functional? They want supremacy over others. This desire, however, only comes up when the internal mechanisms of their bodies are effective – that is, their hearts continue to throb, their intestines and kidneys remain active, their brains receive signals to fuel their nervous systems, their eyes see and their eyeballs remain in motion, and images reflect onto their minds in the blink of an eye. This reflection of images on the mind is a process for the dissemination of information.

One should also muse that we would not be able to see if we had insight but no eyes. In the same way, without a heart, movement will vanish from our sight.

• • ——————————— • •

The process of creatures arriving on Earth has not yet discontinued. The caravan has begun its journey from *Aalam-e-Arwah* (the realm of spirits) and it has to travel through this world. Therefore, resources have been arranged here for the caravan's stay. The purpose of this journey is the realisation of God but on the contrary, people have confined themselves to the resources, and this is nothing but ignorance. One can only live happily if resources are considered as mere mediums to fulfil one's needs. In contrast, if people overvalue resources to the extent that they devalue their own worth, they become overwhelmed by unhappiness. Similarly, the alternation between happiness and sadness is due to our expectations from those who are helpless and in need of resources themselves. What can such a person give to others?

Imam Abu Hanifa (RA) was a reputable cloth merchant. His personal secretary once informed him, "Sir, your ship has sunk in the sea and we have suffered a huge loss".

Imam Abu Hanifa (RA) paused for a few seconds and then said, "O' God! Thank you".

After a few days, news arrived that the ship that had sunk was not his.

Message of the Day

My life revolves around spirituality. This *faqir* has reiterated the same thing over the years, and the subject of my discourse has not changed either. So much has been said in the past 23,725 days and 23,725 nights that now when I wish to say something, the same impressions that I have already communicated to you before, appear on my mind. Hence, when I now feel like writing on any subject or making a speech, it occurs to me that the topic has already been covered.

With the help of God, I have tried every method as per my capabilities to explain spiritual knowledge. I am grateful that you have all appreciated my efforts but I am also well aware that when experience and realisation become a part of students' life, they begin to expect more from their master.

Dear friends, everyone desires to lead a happy, healthy, and a trouble-free life and receives the same advice from everyone they encounter - "Be happy". We all come empty handed into this world and bid farewell to it with nothing in our hands. No one is born wearing clothes, and likewise, when one dies, the clothing on their corpses is cut with scissors to perform final rituals. People have no power over life, yet they consider themselves independent. They believe that one cannot be happy unless they become rulers of their own lives. But if they were independent, then why are they unhappy? In truth, the person who asks others to be happy, is also sad themselves.

Nothing in life attains finality unless two units merge. A person who desires happiness will gravitate towards unhappiness too, and vice versa. Therefore, defining something as being happy or unhappy is merely word play. The truth is, an individual is neither aware of happiness nor unhappiness.

The basic need of life is water which is present everywhere. Similarly, to shelter oneself from heat and cold, it is a pre-requisite to have land for a house to be built upon, and we are all witness to the fact that the creation of the land exists beforehand.

As the fundamental needs of life exist post death and prior to one's birth, this proves that the resources that are present now, will continue to exist even after one's demise. We become apprehensive in our search

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
Values of a Saint	Muhammad Zeeshan	167
Life Lessons from a Faqir	Bibi Anuradha (UAE)	162
The Art of Gratefulness	Muhammad Arif	158
Prophet Jesus (PBUH)	Extracted	151
What Do We See?	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	147

"You have read thousands of books of knowledge, have you ever tried to read your own self ?"

- Baba Bulleh Shah (RA)

Vol 7 Issue 9 | October 2019 | Safar _ Rabi-ul-Awwal 1441AH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya RA

Chief Editor
Khwaja Shams al-Din Azeemi

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.80/- Per issue. Annual subscription Rs.1080/- with Reg. Post (Domestic), US$ 70/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020